باغ کا دروازہ

طارق چھتاری

باغ کا دروازہ

(افسانے)

باغ کا دروازہ

(افسانے)

طارق چھتاری

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

نام کتاب	:	باغ کا دروازہ
مصنف	:	طارق چھتاری
پتہ	:	ناظمہ منزل، امیرنشاں روڈ، دودھ پور، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲
اشاعت	:	اگست ۲۰۰۱ء
ترتیب وانتخاب	:	ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی
سرورق	:	سرفراز
ناشر	:	مصنف
طباعت	:	مسلم ایجوکیشنل پریس، بنی اسرائیلان، علی گڑھ
کمپوزنگ	:	حسان احمد القاسمی
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	Rs. 150/-
ملنے کے پتے	:	* ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
		* دانش محل۔ امین الدولہ پارک۔ امین آباد۔ لکھنؤ
		* انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایوینو۔ نئی دہلی
		* جامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد

BAGH KA DARWAZA (SHORT STORIES) 2001

TARIQ CHHATARI

EDUCATIONAL BOOK HOUSE

UNIVERSITY MARKET- ALIGARH RS.150/-

یاسمین
کے
نام

تعارف

نام	:	محمد طارق
قلمی نام	:	طارق چھتاری
پیدائش	:	یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء
وطن	:	چھتاری ، ضلع بلندشہر (یو پی)
تعلیم	:	ایم اے (اردو)، پی ایچ ڈی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ملازمت	:	پروگرام ایگزیکیٹو، آل انڈیا ریڈیو: آکاش وانی، گورکھپور، جولائی ۸۴ء۔اپریل ۸۹ء۔ اردو سروس، نئی دہلی، اپریل ۸۹ء۔فروری ۹۳ء شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ: لیکچرر ، ۱۸رفروری ۹۳ء ۔ ۲۲فروری ۹۷ء ریڈر ، ۲۳فروری ۹۷ء تا حال
تصنیف	:	جدید افسانہ (اردو۔ہندی) ۱۹۹۲ء

اس کتاب کے بارے : طارق چھتاری کا پہلا افسانوی مجموعہ ''باغ کا دروازہ'' ان کے تقریباً پچیس سالہ ادبی سفر کا حاصل ہے۔اس مدت میں کہانیوں کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آسکتی تھیں لیکن موضوعات کے انتخاب میں افسانہ نگار کی احتیاط پسندی اور کسی اچھوتے پہلو کی تلاش بسیار نویسی میں مانع رہی۔ مجموعے میں شامل بعض افسانے مثلاً ''گلوب، پورٹریٹ، برف اور پانی، شیشے کی کرچیں، ہزمبان، اور ''دھوئیں کے تار'' کی تفہیم میں ممکن ہے روایت پسند قارئین کو الجھن کا سامنا ہو۔اس الجھن کی وجہ افسانہ نگار کا وہ مخصوص فنی طریق کار ہے جس کے تحت کسی لفظ یا جملے کی مدد سے منظر بدلنے یا ماضی کو حال میں مدغم کرنے کی کوشش

کی گئی ہے۔ان افسانوں میں جہاں شہری زندگی اور اس کے مسائل، انسانی رشتوں، رویّوں، ذہنی الجھنوں یا نفسیاتی گوشوں کو کسی نہ کسی حوالے سے گرفت میں لینے کی سعی کی گئی ہے وہیں ''چھلاوا اور وہ، آن بان، اور'' لکیر'' میں دیہاتی زندگی کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس فہرست میں ''صبحِ کاذب'' اور ''دس بیگھے کھیت'' کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جس میں بدلے ہوئے حالات میں کسان کے نئے مسائل اور مجبوریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ'' کھوکھلا پہیّا، آدھی سیڑھیاں، اور'' تین سال'' قصباتی زندگی کے گرد گھومتی ہوئی کہانیاں ہیں۔دیہی اور قصباتی پس منظر میں لکھی گئی کہانیوں میں بہت سے اجنبی اور تکنیکی الفاظ بھی آگئے ہیں جو بہ وجوہ افسانے کی بنت کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

خارجی سطح پر آگے بڑھنے والا فن پارہ کس طرح داخلی مسئلے کا اظہار بن جاتا ہے، اس کی ایک مثال فن کار کا مشہور افسانہ ''نیم پلیٹ'' ہے۔اس سے بالکل مختلف انداز کا افسانہ'' باغ کا دروازہ'' ہے جس میں مخصوص الفاظ و تراکیب کی مدد سے معنوی افق وسیع کرنے اور اس کے ساتھ ہی قصّے کہانی کی روایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔مجموعے کا آخری افسانہ'' چابیاں'' افسانہ نگار کے پسندیدہ فنی حربوں کی کرشمہ سازی، پیچیدگیِ بیان اور دھند میں لپٹی ہوئی پراسرار فضا کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔

مختلف ماحول، فضا اور موضوعات کی ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے فنی باریکیوں کے علاوہ موضوع، ماحول اور اسلوبِ بیان کے تنوع کا خاص خیال رکھا ہے۔

قمرالہدیٰ فریدی

ترتیب

دھوئیں کے تار

وہ دونوں پانی میں پڑے ایک بڑے پتھر پر آ کر بیٹھ گئے۔

چاروں طرف آڑی ترچھی پتھریلی لکیروں میں بہتے پانی کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پانی کی ناگنوں کے درمیان گھرے بیٹھے ہیں۔ مصنوعی جھرنے کے شفاف پانی کی بوندیں ان کے چہروں پر موتی بکھیر رہی تھیں۔

موتیوں کی مالا جو امی کے گلے کی زینت تھی،

رعنا نے سمیر کے ہاتھ سے لے کر اسی کی جیب میں ڈال دی، اور پھر سمیر کی جیب میں پڑی مالا کے موتیوں کو اپنی نرم نرم انگلیوں سے سہلاتے ہوئے بولی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی کچھ روز پہلے آویز نے ایک حیدر آبادی ہار دیا تھا، ہے میرے پاس۔"

"لیکن ——"

'لیکن' کے علاوہ اس وقت وہ جو بھی کہتا، اس کا مطلب بھی 'لیکن' ہی ہوتا۔ اس لیے وہ خاموش رہا۔

"چلیں —— "

یہ کس نے کہا تھا؟

شاید کسی نے نہیں——

مگر دونوں نے سنا'

پھر وہ اپنے اپنے ہاسٹل جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ دور ایک ہی راستے پر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"او کے۔ گڈ بائے.............."

رعنا نے سمیر کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ ہلایا اور گیٹ کے اندر چلی گئی۔

سمیر اپنے کمرے جانے کے بجائے بلا ارادہ آویز کے فلیٹ کی جانب مڑ گیا اور بہت دیر تک کالونی میں گھومتا رہا۔

شاید بکھرے موتیوں کو دھوئیں کے تار میں پرونے کی کوشش کر رہا تھا۔

دھوئیں کے مرغولے ہونٹوں سے نکل کر چھلوں کی شکل میں اس کے سر پر منڈلانے لگے۔

"ہے میرے پاس —— آویز کا دیا ہوا ہار ہے میرے پاس —— "

"یہ کیا بات ہوئی؟ اگر ہے بھی، تو اس کا یہ کہاں مطلب ہوتا ہے کہ میرا دیا ہوا ہار واپس کر دیا جائے۔"

کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"گاڈ نوز؟"

اور آسمان کی طرف دیکھا۔

سر پر منڈلاتے دھوئیں کے چھلے فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔

سگریٹ جھاڑی میں پھینک دی اور مسکرانے لگا۔

مسکراہٹ کا سبب؟

"مسکراہٹ؟"

نہیں، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں، بلکہ اس ریڈنگ روم کی کھڑکیوں کے شیشے جھلملا رہے تھے جہاں اسے کل پھر رعنا سے ملنا تھا۔

اور کل جب آج میں تبدیل ہوا تو سمیر نے رعنا کو ریڈنگ روم میں انتظار کرتے پایا۔

"رعنا' میں ساری رات جاگتا رہا ——"

اتنا کہنے پر کہ

"سلمٰی، میں ساری رات جاگتا رہا۔"

قصبے کے آبائی مکان کی بالائی منزل پر ابو کے کتب خانے میں چھپی ایک معصوم نازک سی لڑکی سلمٰی نے سمیر کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی گود میں سُلا لیا تھا۔

مگر رعنا نے بے نیازی سے کہا۔

"ہوتا ہے۔ میں بھی بہت دیر تک جاگتی رہی۔"

"تم بھی؟"

"بھی" پر اتنا زور تھا کہ رعنا تھوڑا پیچھے کھسک کر اسے گھورنے لگی پھر مسکرا کر دھیرے سے بولی۔

"سمیر' میں ابھی آئی ——"

سمیر نے دیکھا ریڈنگ روم کے دروازے پر منوج کھڑا تھا۔ رعنا بل کھا کے ایسے گھومی کہ ایک ہی پل میں منوج کے پاس جا پہنچی۔

منوج آویز اور.........

سب اپنی اپنی جگہ موجود ہیں۔

"مگر میں کہاں ہوں؟"

"ٹھیک ہے، آج کے بعد سوچوں گا بھی نہیں کہ........."

کہ اچانک رعنا پلٹی اور سمیر کے پاس آ کر بولی۔

"میرا انتظار کرنا، ابھی آئی........."

سمیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہ کر ناراضگی اور غصے کے حربے کو استعمال

کرنا چاہا مگر رعنا..........؟

وہ کہاں دیکھنے والی تھی اس کی طرف۔

چلی گئی —

جب چلی گئی تب معلوم ہوا کہ وہ اس سے کتنا..........

پھر آ گئی

لیکن اس طرح نہیں جیسے ترنم آئی تھی، مسکراتی ہوئی، اور ثمیر کے کندھے پر سر ٹکا کر بولی تھی۔

''تم ناراض ہو..........''

ثمیر خاموش رہا تھا تو ترنم اس سے لپٹ گئی تھی۔

''ثمیر۔''

''ہوں—''

''تمہیں معلوم ہے میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں؟ نہیں معلوم، تو میری آنکھوں میں دیکھو، قریب آ کر..........''

اور پھر ایک سیر حاصل لمحے کے بعد ترنم کی محبت اس طرح غائب ہو گئی تھی جیسے ثمیر کے سر کے نیچے سے سلمیٰ کی گود۔

لیکن رعنا..........

رعنا بڑی بے پروائی سے ترنم کے مسکراتے ہونٹوں پر چلتے ہوئے سلمیٰ کی گود میں کود پڑی اور چپکے سے ثمیر کے دل میں دھڑکنے لگی۔

اور پھر ریڈنگ روم میں کب سامنے آ کر بیٹھ گئی، ثمیر کو احساس ہی نہیں ہوا۔

''رعنا تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

رعنا نے ثمیر کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور اس کی نگاہیں ثمیر کے چہرے سے ہٹ کر، چہرے کے پیچھے کی دیوار پر مرکوز ہو گئیں۔

ثمیر کے چہرے کے پیچھے دیوار سے لگا شیراز کھڑا تھا۔

ثمیر نے مڑ کر دیکھا اور شیراز ان دونوں کے درمیان کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''سمیر تمہارا خط۔''

''خط لکھتے رہنا بیٹے......'' امی نے کہا تھا اور ابو کی تصویر دیکھ کر رونے لگی تھیں۔

''امی شہر دور ہی کتنا ہے؟ ہر ہفتے آ جایا کروں گا۔''

مگر کئی مہینے ہو گئے۔ جانا تو دور، خط بھی نہیں لکھ سکا۔ امی کا خط شیراز کے ہاتھ سے لے کر بغیر کھولے کتاب میں رکھ لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے رُکا رہا لیکن رعنا اسی طرح بیٹھی شیراز سے باتیں کرتی رہی۔

شیراز اور رعنا — منوج، آویز — موتیوں کا ہار — آج پھر دھوئیں کے چھلّے اس کے سر پر منڈلانے لگے اور کئی دن تک منڈلاتے رہے۔

نہ اس نے امی کا خط کھولا اور نہ ہی رعنا سے ملا۔

یوں تو رعنا روز ملتی تھی۔ اکثر دونوں لائبریری کے لان میں ٹہلتے بھی تھے۔ اِن دنوں باتیں بھی کچھ زیادہ ہی دیر تک ہوتی تھیں مگر وہ اس کے باوجود رعنا سے نہیں ملا تھا۔

اور پھر ایک روز جب اس نے امی کا خط کھولا تو دیکھا کہ رعنا قریب بیٹھی، وہ سب کچھ کہہ رہی ہے جو امی کے خط میں لکھا تھا۔

''حیرت ہے، امی اور رعنا کبھی کبھی بالکل ایک............''

اسے لگا کہ رعنا کے منہ سے امی کے ہار کے موتی جھڑ رہے ہیں۔

کبھی اتنی دوری — کبھی اتنی قربت!

بادل کا ٹکڑا سورج کے سامنے سے گزرا اور سمیر کے سر پر دھوپ چھاؤں کا منظر بکھیر گیا۔

خط کھلا ہوا تھا، رعنا کچھ کہہ رہی تھی، لیکن اس نے نہ کچھ پڑھا اور نہ کچھ سنا، بس اٹھ کر اس جانب چل دیا جہاں ملن کھڑی تھی۔ رعنا سے دور ملن کے پاس پہنچ کر لگا کہ آج وہ ہزاروں سال بعد رعنا سے مل رہا ہے۔ رعنا سے اتنی قربت پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''تعجب ہے!'' اس نے سوچا اور ملن ''بائے'' کہہ کر چلی گئی۔

آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر ترنم تنہا بیٹھی تھی۔ رعنا سے ملنے کے شوق میں قدم خود بخود سیڑھیوں پر بیٹھی ترنم کی جانب اٹھ گئے۔

''ہیلو — ''

ترنم نے کہا اور سمیر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ترنم جتنا اس کی طرف کھسکتی آتی اُتنا ہی وہ ترنم سے دور اور رعنا کے قریب ہوتا جاتا۔

''عجیب بات ہے؟''

پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں تو سلمیٰ نے، جو آج بھی اس کے والد کے کتب خانے میں موجود تھی، سمیر کو اپنی گود میں سلا لیا۔ سلمیٰ کی گود سے رعنا کے جسم کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

وہ اس احساس سے پہلی بار آشنا ہوا تھا۔

''تو کیا یہ رعنا سے پہلی ملاقات ہے؟ کیا رعنا سے قربت کے احساس کے لیے چند نرم و نازک دیواروں کا حائل ہونا ضروری ہے؟''

سامنے لان میں رعنا اکیلی بیٹھی تھی۔ دوپٹے کا پلو کھسک کر گود میں آن گرا تھا۔

سمیر نے منہ پھیر لیا اور سائنس فیکلٹی کی لڑکیوں کو کینٹن جاتے دیکھ مسکرانے لگا۔ جب وہ لان کا لمبا چکر کاٹ کر کینٹن پہنچا تو دیکھا کہ رعنا کینٹن میں دروازے کے بالکل سامنے والی میز پر بیٹھی چائے پی رہی ہے۔ وہ بھی اسی میز پر جا بیٹھا۔

''سمیر مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

سمیر نے رعنا کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور اس کی نگاہیں رعنا کے چہرے سے ہٹ کر، چہرے کے پیچھے کی دیوار پر مرکوز ہو گئیں۔ رعنا کے چہرے کے پیچھے دیوار سے لگی شبانہ کھڑی تھی۔

''شبانہ کون!''

''ملن ؟''

''ملن ؟ مطلب سلمیٰ ——''

''سلمیٰ یا ترنم ؟''

''کوئی بھی، بس رعنا نہیں۔''

اس کی نظروں میں رعنا کے علاوہ سب کے چہرے، جو ہو بہو ایک سے تھے، تیزی سے گھومنے لگے۔

رعنا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور شبانہ ان دونوں کے درمیان کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سمیر کو

لگا کہ اس کے اور رعنا کے درمیان کے سارے فاصلے مٹ گئے ہیں۔

اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جھومتا ہوا اٹھا اور کینٹن کے باہر چلا گیا۔

عجیب بات تھی کہ جس رعنا کو وہ کینٹن کے اندر چھوڑ کر آیا تھا وہی رعنا اسے باہر کھڑی ملی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

اب تک وہ وصال کی اس لذت سے نا آشنا تھا۔ وہ راز جو شوق کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد ہاتھ آتا ہے، اب اس پر پوری طرح کھل چکا تھا۔

شہر آنے کے بعد اس نے دیکھا کہ یہاں ہر سُو محبتوں کی بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔

نئے زمانے کی محبتیں۔

ملن۔

مگر اب وہ سمجھنے لگا تھا کہ

یہ ملن اور ہے —— محبت کا ملن اور ——

لگتا ہے رعنا اس راز سے بہت پہلے سے واقف تھی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ سمیر سے ایک احساس بھر فاصلہ ہی اسے سمیر کے قریب لا سکتا ہے۔

''منوج، تم جانتے ہو محبت کسے کہتے ہیں۔''

''ہاں اچھی طرح۔''

منوج کے اس جواب پر سمیر دل ہی دل میں ہنسا تھا۔

''اور شیراز تم؟''

''ہاں ——''

''اور آویز تمہاری محبت کی جیت تو موتیوں کا ایک ہار ہے۔

لیکن میرے بھائی، محبت میں موتیوں کو دھوئیں کے تار میں پرونا پڑتا ہے۔''

آویز نے سمیر کی خاموش گفتگو کے سلسلے کو یہ کہہ کر توڑا۔

''اب چلیں، آج فیرویل پارٹی ہے۔ شام ہو چکی ہے۔''

''ہاں چلو...... اب دن رخصت ہو رہا ہے اور دونوں وقت مل رہے ہیں۔''

اور وہ سب اس محفل میں شریک ہونے کے لیے چل دیے جہاں رخصت ہونے کی

رسم ادا ہونا تھی۔ درحقیقت رخصتی کی رسم ہی ملن کی رسم تھی۔ ایسا ملن جس کے بعد رخصت ہونے کا خوف ختم ہو جاتا ہے۔

اس محفل میں رعنا تھی جو سب سے زیادہ خوش تھی اور سب سے زیادہ اداس بھی۔ اسے مل کر رخصت ہونا تھا یا رخصت ہو کر ملنا؟ معلوم نہیں —— فی الحال وہ شیراز کے ساتھ پانی کی ناگنوں کے درمیان گھرے ایک بڑے پتھر پر بیٹھی تھی اور مصنوعی جھرنے کے شفاف پانی کی بوندیں اس کے چہرے پر موتی بکھیر رہی تھیں۔

سمیر اس سے بہت دور آویز کے ساتھ کھڑا تھا۔ رعنا نے دور کھڑے سمیر کو نظر بھر کے دیکھا۔ سمیر کا چہرہ پانی کی تہوں میں ڈوبتا ابھرتا دکھائی دیا۔ دراصل سمیر کے چہرے اور رعنا کی نظروں کے درمیان ان آنسوؤں کی پرتیں حائل تھیں جو رعنا کی پتلیوں کے پیچھے چھپے مسکرا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد آویز مولسری کے پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ اب سمیر تنہا رہ گیا تھا۔ سمیر نے محسوس کیا کہ رعنا شیراز کے پاس سے اٹھ کر یہاں اس کے قریب آنا چاہتی ہے۔ رعنا نے پہلو بدلا تھا۔ اس کا دل اُچھلا۔ ”نہیں رعنا نہیں۔ میں دھوئیں کے تار میں موتی پرو رہا ہوں۔ ایک احساس بھر فاصلہ ضروری ہے۔ اگر تم میرے پاس آ گئیں تو یہ تار تمہارے سانسوں کی گرمی سے پگھل جائے گا اور تمام موتی بکھر جائیں گے۔ ہاں رعنا، تم سلمٰی کی گود بن گئیں تو شاید میری محبت مر جائے گی۔ اور اگر میں تمہارے لیے بازار سے خریدا ہوا موتیوں کا ایک ہار بن گیا اور تم مسکراتے ہوئے میرے پاس آ بیٹھیں تو تمہارے ہاتھ سے محبت کا سرا چھوٹ جائے گا۔ کیوں کہ تم میرے پاس آنے کے لیے مجھے ہی جھرنے کے پیچھے تنہا چھوڑ کر آؤ گی۔“

اس نے دیکھا رعنا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جیسے جیسے وہ سمیر کے قریب آتی جا رہی ہے۔ سمیر کا چہرہ چھوئی موئی کے پتوں کی طرح مرجھاتا جا رہا ہے۔ ”وہ دیکھو رعنا میرے پاس سے اٹھ کر ادھر جا رہی ہے۔“

”میرے پاس سے؟ وہ تو شیراز کے پاس بیٹھی تھی۔“

”وہ شیراز کے پاس بیٹھی تھی۔ اسی لیے تو میرے پاس تھی۔ اب میرے پاس آ رہی ہے تو کیا شیراز کے قریب جانا چاہتی ہے؟“

”نہیں رعنا، تمہیں تو صرف مجھ سے بے اعتنائی کا حق حاصل تھا۔ شیراز سے......“

اب رعنا اس کے بہت نزدیک آ چکی تھی۔ شیراز پانی کی ناگنوں کے درمیان گھرے ایک بڑے پتھر پر تنہا بیٹھا رہ گیا تھا۔

"نہیں۔"

سمیر نے آنکھیں بند کرلیں اور گھوم کر کھڑا ہوگیا۔ محسوس ہوا کہ رعنا کی گرم سانسیں اس کے وجود کو پگھلا رہی ہیں۔ اس کے کندھے جل رہے تھے۔

"مجھ سے یہ التفات کہیں شیراز سے تمہاری محبت کا ثبوت تو نہیں؟"

"میں تمہارے لیے منوج تو نہیں؟"

"کہیں تم ترنم کی جھلملاتی مسکراہٹ تو نہیں، جو ایک لمحے کے لیے بجلی کی طرح کوند کر تاریکی میں ڈوب جاتی ہے؟"

"کہیں میں بازار میں بکنے والا موتیوں کا ہار تو نہیں؟"

"نہیں ——"

"اگر دیکھ سکتی ہو تو دیکھو، میرے ہاتھ میں ایک تار ہے۔ بکھرے موتیوں کو پرونے کے لیے ایک تار۔ اگر اتنا قریب آ گئیں تو تمہارے لمس کی گرمی سے یہ تار پگھل کر میری اور تمہاری رگوں میں اتر جائے گا اور ہماری محبت مر جائے گی —"

سمیر کی آنکھیں بند تھیں اور سانس رکنے لگی تھی۔

"کیا تم پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر میرا ہی جنازہ رکھ دو گی۔ نہیں........"

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تھوڑی دیر ساکت کھڑا رہا۔ ایک لمحہ گزرا یا شاید ایک صدی گزر گئی، وہ کھڑا رہا۔ ہمت کر کے آنکھیں کھولیں، مڑ کر دیکھا، وہاں رعنا نہیں تھی۔ مصنوعی جھرنا تھا۔ بڑا پتھر تھا۔ پانی کی ناگنیں تھیں، مگر رعنا نہیں تھی۔ شیراز بھی نہیں تھا۔ سمیر نے رعنا کے قدموں کی خوشبو کو محسوس کیا۔ اس کی نظریں خوشبو کا تعاقب کرنے لگیں۔ قدموں کی مہک چھن چھناہٹ میں تبدیل ہونے لگی۔ ایسی چھن چھناہٹ جو صرف سنائی نہیں دیتی بلکہ دکھائی بھی دیتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہ خوشبو اس کے برابر سے گزرتی ہوئی مولسری کے درخت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس مولسری کے درخت کی طرف جہاں آویز تنہا بیٹھا تھا۔ سمیر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ مولسری کے خوشبودار پھول رعنا کے قدموں کو چوم رہے تھے۔ شیراز بھی ساتھ تھا۔

درخت کے نیچے بیٹھا آویز تھوڑی دیر تک رعنا اور شیراز کو اپنی طرف آتے دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر دونوں کے قریب جا پہنچا۔ اب وہ تینوں رفتہ رفتہ ثمیر سے دور ہوتے جارہے تھے کہ رعنا نے مڑ کر ثمیر کی طرف دیکھا۔

رعنا کا مڑ کر دیکھنا تھا کہ ثمیر نے مسکراتے ہوئے آسمان پر نظر ڈالی اور فضا میں دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا اور آسمان سے موتیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آسمان سے برسنے والے موتیوں کو دھوئیں کے تار میں ایک ایک کر کے پروتا چلا جا رہا ہے۔

○○○

آن بان

''کیا؟ ہری سنگھ کی شادی ہو رہی ہے؟ ارے کسی نے یوں ہی اُڑا دی ہوگی۔''

''اجی نہ چودھری صاحب، بات سولہو آنہ پکی ہے۔'' سندر نے کہا۔

''مگر بھئی، یہ ہوا کیسے؟''

''کان میں اُڑتی اُڑتی پڑی ہے کہ گھٹیا والے ننوا نے بات لگائی ہے۔'' سندر گردن کا میل چھڑاتے ہوئے بولا۔

''کس کے ہاں؟''

رام نگر والے ٹھاکر نیک سنگھ کے ہاں۔''

''مگر یہ تو دھوکا ہے۔'' چودھری صاحب نے فرشی حقہ اپنی طرف کھینچا جسے سندر ابھی ابھی تازہ کر کے لایا تھا۔ شہزاد خاں گلیارے سے گزر رہے تھے، چودھری صاحب کو حقہ پیتے دیکھا تو وہ بھی چوپال پر دھوپ میں آن بیٹھے۔

''سنا آپ نے، ہری سنگھ کی شادی ہو رہی ہے۔''

''ہاں چودھری صاحب سنا تو ہے۔ معلوم نہیں ٹھا کر صاحب نے کیا سوچا ہے۔ جب اس کی ماں مری تھی تو بے چارے کی عمر ہی کیا تھی۔ تبھی سے اس کی یہ حالت ہوگئی ہے، جہاں جھلستی گرمیاں آئیں اور لگے دورے پڑنے۔''

شہزاد خاں نے حقے کی چلم اٹھائی اور کش لگانے لگے۔

''مگر خاں صاحب، اس حالت میں شادی؟ وہ تو عورت کو لال جوڑے میں دیکھ کر بالکل ہی پاگل......''

شہزاد خاں نے چلم پھر نیچے پر جما دی اور بولے۔ ''بھئی دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے لال رنگ سے، شادی کے بعد شاید نکل جائے۔''

چودھری صاحب نے حقے کی نے کو مٹھی میں بھر کر منہ سے لگا لیا، آج انہیں تمبا کو بہت کڑوا محسوس ہوا، کھانستے ہوئے سندر سے بولے۔ ''کیا شیرہ کم ڈالا ہے؟ دھانس بہت ہے۔'' سندر نے جواب تو دیا مگر چودھری صاحب کچھ نہ سن پائے اور کھانستے ہی رہے۔ سنتے بھی کیسے، ٹھا کر تیج بہادر سے ان کا پرانا بیر تھا۔

سورج سر پر آ چکا تھا مگر اب بھی اس کی کرنیں سردی سے کانپ رہی تھیں۔ ہری سنگھ کے پتا ٹھا کر تیج بہادر مہمانوں سے کہہ رہے تھے۔ ''شادی بیاہ کا مزہ تو سردیوں میں ہی ہے۔'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ ٹھا کر تیج بہادر اپنے بیٹے کی شادی سردیوں میں کیوں کر رہے ہیں، ہر آدمی انجان بنا ہوا تھا۔ ہری سنگھ کی بوا نے اسے نہلا دھلا کر دولھا بنا دیا۔ محلے کی عورتوں نے کھونٹی پر ٹنگی ڈھولک کو ڈرتے ڈرتے اتارا، ڈوریاں کسیں اور پھر ڈھولک کی تھاپ اور گیتوں کی آواز نے سبھی کے دل سے ڈر نکال دیا۔ برات چلی گئی، پورے ٹولے میں رت جگا ہوا، محلے بھر کی عورتیں ناچتی گاتی رہیں۔ گلی کے نکڑ پر رات بھر دیسی گھی کے دو چراغ جلتے رہے اور دوسرے دن بہو گھر میں آ گئی۔ محلے کی کچھ بڑی بوڑھیوں کا کہنا ہے کہ رات ایک دیا بجھ گیا تھا، چپکے سے ہری سنگھ کی بوا نے جلا دیا۔ بوا مارے خوشی کے بہو کے پیروں میں بچھی پڑ رہی تھیں اور اتنی بار لجا کی بلائیں لی تھیں کہ اب ان کی انگلیوں نے چٹخنا بند کر دیا تھا۔ بوا نے دودھ سے بھرا دھنو کمہار کے ہاں کا بنا مٹی کا نقشیں پیالہ بہو کے ہونٹوں سے لگا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بولیں۔ ''پی لے بہو...... بہت تھک گئی ہوگی۔''

چوبارے کے سامنے والا اٹا، جس میں پیاز پڑے پڑے کلّے دینے لگی تھی، جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا گیا۔ جب رات اونگھنے لگی تو ہری سنگھ کو اوپرائے میں لجا کے پاس بھیج دیا گیا۔ لجا گھٹنوں میں سر دیے لال شینیل کی چادر اوڑھے مسہری پر بیٹھی تھی۔ ہری سنگھ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے مگر اتنا جانتا تھا کہ اسے کچھ کہنا ہے، آخر بول پڑا۔

''وید جی کہہ رہے تھے اب میری طبیعت خراب نہیں ہوگی۔ گرمیوں میں بھی نہیں۔''

پھر تھوڑی دیر رک کر بولا۔ ''تم وید جی کو نہیں جانتیں، وہ پتا جی کے متر ہیں۔ جب مجھے دورے پڑنے شروع ہوئے تو پتا جی نے اسکول سے اٹھوالیا، مگر وید جی نے پڑھانا نہ چھوڑا۔ میں نے ان سے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ میرے گرو ہیں۔''

لجا نے گھونگھٹ کے اندر سے جھانکا اور پھر گردن جھکالی، کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات آگے بڑھائے۔ پھر اس کی نظریں اٹھیں اور ائے کے چاروں کونوں میں گھومتی ہوئی لجا کے گھونگھٹ پر آ کر ٹھہر گئیں۔

سرخ کپڑوں میں دہکتی ایک عورت۔ لجا۔ اس کی ماں، چتا اور جھلستا ہوا اس کا بدن، نہیں ...... چیخ اس کے اندر گھٹ کر رہ گئی۔ مڑ کر دیکھا تو پرات میں انگارے دہک رہے تھے۔ سردی بہت تھی، بوا نے پرات میں انگارے رکھ دیے تھے۔ کونے میں لالٹین جل رہی تھی۔ جلتی ہوئی لالٹین لجا کے سرخ کپڑے، پرات میں دہکتے انگارے...... اسے اپنے جسم سے چنگاریاں سی اٹھتی محسوس ہوئیں، چنگاریاں آگ کی لپٹیں بن گئیں۔ اونچی اونچی لپٹوں کے درمیان اس کی ماں کا بدن جھلس رہا ہے۔ وہ سب سے چھپ کر بہت آگے جا کھڑا ہوا ہے۔

''ماں۔''

''آجا ہری..........''

ماں نے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ ہری سنگھ بانہوں میں جا کر جھول گیا۔

''ارے نگوڑے تنک دیکھ کے۔ چولھے پر توا چڑھا ہے۔ چل ادھر بیٹھ۔''

ماں نے اس کے آگے بیسن کے چیلے پروس دیے۔ اس نے تھالی ایک طرف کو ہٹائی اور ہمک کر ماں کے پاس آن کھسکا۔ ماں نے چولھے میں ایک لکڑی اور رکھ دی۔ آگ بھڑک اٹھی۔ ماں کا بدن جھلسنے لگا۔ چتا کی لپٹیں تیز ہوگئی تھیں۔ ''ماں''۔ وہ چیخا اور چتا میں جلتی ماں کی بانہوں میں جا کر جھول گیا۔ سبھی کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بھولا نے بڑھ کر اسے کھینچا

مگر اس کا داہنا ہاتھ بالکل جھلس چکا تھا۔ کئی دن بے ہوش رہا اور جب ہوش آیا تو ایک زوردار چیخ اٹھا کر تیج بہادر کے آنگن میں گونجی۔

''کیا ہوا؟'' لجّا اس کی چیخ سن کر گھبرا گئی۔

''کچھ نہیں۔ وید جی کہہ رہے تھے، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

سرخ چادر کا گھونگھٹ لجّا کے سر سے کھسک کر کندھوں پر ڈھلک آیا تھا اور وہ گم صم ہری سنگھ کو تکے جا رہی تھی۔ ہری سنگھ نے دیکھا کہ اس کے ماتھے کی سرخ ٹکیا پھیلتی جا رہی ہے۔ کونے میں جلتی لالٹین، دہکتے انگاروں سے بھری پرات، سرخ چادر اور ماں کی چتا، سب کچھ لجّا کی سرخ بندیا میں سمٹ آیا تھا۔ وہ آگ کے گولے میں لجّا کو ڈھونڈنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پیروں میں کپکپاہٹ ہوئی۔ لڑکھڑایا، گرا، سنبھلا اور پھر اس نے خود کو اٹے کے باہر چوبارے کے اس طرف کھلی اور ویران چھت کی منڈیر پر اکیلا بیٹھا پایا۔

لجّا رات گئے تک انتظار کرتی رہی مگر جب ہری سنگھ نہیں آیا تو وہ اٹھی، بھڑے ہوئے کواڑ دھیرے سے کھولے اور باہر جھانکنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ ہری سنگھ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے چھجے پر پیر لٹکا کر منڈیر پر بیٹھا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ننگے پاؤں چلتی ہوئی اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر چپکے سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ ہری سنگھ نے مڑ کر دیکھا اور کچھ کہنا چاہا مگر آواز جھلسے ہوئے کاغذ کی طرح بھربھرا کر رہ گئی اور وہ صرف اٹے کی طرف اشارہ ہی کر سکا۔ لجّا گردن جھکائے کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہری سنگھ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لجّا اسی طرح کھڑی رہی۔ ہری سنگھ نے ڈھینچے کی لکڑیوں کے گٹھر سے ایک لکڑی کھینچی اور وہ کچی چھت کی مٹی کو کریدنے لگا۔ تھوڑی دیر تک مٹی کو کریدا، کچھ ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچیں، پھر لکڑی کو توڑا اور باہر گلی میں پھینک دیا۔ لجّا نے بڑھ کر ہری سنگھ کا بازو پکڑ لیا۔ ہری سنگھ نے اس کی طرف دیکھا وہ خشک آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ اب اس نے لجّا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا تھا۔ لجّا کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں اور کاجل رخساروں پر اتر آیا تھا۔ نہ ہری سنگھ نے کچھ کہا اور نہ ہی لجّا کچھ بولی۔ بس دونوں اٹے میں ایک ساتھ داخل ہوئے اور ہری سنگھ نے دروازہ بند کر لیا۔ لجّا سمٹ کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ لالٹین انہیں گھور رہی تھی۔ ہری سنگھ نے اٹھ کر لالٹین کے مہرے کو گھمایا اور جب بتی اتنی گر گئی کہ چمنی کے احاطے سے باہر نکلنا روشنی کے بس میں نہ رہا تو اس نے لجّا کے بدن سے پھوٹتی روشنی میں پناہ لی۔ یہ روشنی سرخ نہیں تھی،

سبز بھی نہیں تھی، اس کا کوئی رنگ نہیں تھا، یا پھر اس میں سارے رنگ موجود تھے۔ زندگی اور موت کے سارے رنگ۔ وہ رات بھر اسی روشنی کی نرم آگ کے ایک نئے احساس کو اپنے وجود میں اتارتا رہا۔ اور یہ آگ پانی بن کر اس پر برستی رہی اور پھر دھیرے دھیرے اس کے جسم کی تمام چنگاریاں بجھ گئیں۔

صبح ہوئی تو ہری سنگھ کی بوا نے دیکھا کہ لجا شرمائی لجائی اٹے سے نکل رہی ہے، وہ پھولے نہیں سمائیں۔ ٹھاکر صاحب نے سنا تو سیدھے وید جی کے ہاں دوڑ پڑے۔ ''وید جی بھگوان کی دیا ہوئی۔ لجا خوش ہے، ایشور آپ کا بھلا کرے''۔ پھر گھر لوٹے اور کئی برس سے بکسے میں بند پڑی بسنتی پگڑی کو نکالا، سر پر سجایا اور لٹھ ہاتھ میں لے کر بازار کی طرف چل پڑے۔ بوا نے کئی طرح کے پکوان تیار کرنے شروع کر دیے۔ لجا کے پتا ٹھاکر نیک سنگھ کے آنے کا سمے ہو گیا تھا۔

ہری سنگھ پوکھر والے موڑ پر ٹھاکر نیک سنگھ کی بس کے انتظار میں صبح سے ہی کھڑا تھا۔ بسیں گزرتی رہیں اور شام ہو گئی۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنے ہی والا تھا کہ ایک بس آ کر رکی اور اس میں سے ٹھاکر نیک سنگھ اترے۔ ہری سنگھ بڑھ کر ان کے پیر چھونے کو جھکا۔ ٹھاکر نیک سنگھ نے تعجب سے ہری سنگھ کو دیکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ہری سنگھ کے ہاتھ دگڑے کی دھول میں جا دھنسے، دھول اڑ کر پتا نہیں کیسے ٹھاکر نیک سنگھ کی آنکھوں میں بھر گئی۔ ہری سنگھ کے سامنے فضا شفاف تھی اور ٹھاکر نیک سنگھ کے سامنے غبار آلود۔

جب ہری سنگھ ٹھاکر نیک سنگھ کو لے کر گھر پہنچا تو بوا دروازے کے باہر چھپر کے نیچے کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھیں، جلدی سے اندر گئیں اور دالان میں کھاٹ بچھانے لگیں۔ ہری سنگھ بھاگتا ہوا کوٹھے میں گیا اور ایک نئی دری لا کر کھاٹ پر بچھا دی۔ ٹھاکر نیک سنگھ بیٹھ گئے اور اپنا صافہ اتار کر سرہانے رکھ دیا۔ لجا پیتل کا بڑا گلاس بھر کر دودھ لے آئی۔ ٹھاکر نیک سنگھ نے آہستہ سے پوچھا۔ ''بٹیا...... راضی خوشی ہو'' اور لجا نے شرما کر گردن جھکا لی۔

ٹھاکر تیج بہادر بازار میں دن مندے تک ٹہلتے رہے۔ پورے پھڑ کے کئی چکر لگائے اور جب گھر لوٹے تو انہوں نے دیکھا کہ آسمان پر چاند اور کھاٹ پر ٹھاکر نیک سنگھ براجمان ہیں۔ دونوں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ہری سنگھ نے پیتل کی لٹیا میں پانی بھر کر ان کے پاس رکھ دیا۔ بوا نے دری کا کونا ہٹایا اور کھاٹ کی ادوائن میں دو گلاس اڑس

دیے۔ ٹھاکر نیک سنگھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے رہے مگر جیسے ہی وہ ہری سنگھ کو دیکھنے کی کوشش کرتے، ڈگڑے کی دھول ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا بن کر چھا جاتی۔

جب رات بولنے لگی تو ہری سنگھ لجّا کے پتا کی پائینتی آ کر بیٹھ گیا اور اپنے مضبوط ہاتھ رضائی کے اندر ان کی پنڈلیوں پر رکھ دیے۔ ''پتا جی، آپ تھک گئے ہوں گے۔''

ٹھاکر نیک سنگھ جیسے اچھل پڑے، پھر کروٹ لی' ٹانگیں سمیٹیں اور بغیر کچھ کہے منہ موڑ کر سو گئے۔ ہری سنگھ حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ دوسرے دن لجّا کو ٹھاکر نیک سنگھ کے ساتھ جانا تھا۔ وہ چلی گئی اور ہری سنگھ کو لگا جیسے اس کے جسم سے کوئی چیز نکال لی گئی ہو۔

کئی مہینے بیت گئے لجّا واپس نہیں آئی۔ ہری سنگھ نے دو چار چٹھیاں لکھیں مگر کوئی جواب نہیں۔ ہری سنگھ کے پتا بلانے گئے مگر اکیلے ہی لوٹ آئے، پوچھے جانے پر کچھ بھی نہیں بتایا۔ پھر اچانک ایک دن لجّا کی چٹھی ملی، بس اتنا لکھا تھا۔ ''پتا جی سے کہو مجھے آ کر لے جائیں۔'' جب ہری سنگھ نے ٹھاکر تیج بہادر کو چٹھی دکھائی تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ ''میں ایک بار جا کر لوٹ آیا ہوں۔ اور پھر ریت تو یہ ہے کہ ٹھاکر نیک سنگھ خود بہو کو یہاں چھوڑنے آئیں۔''

ایسی کسی ریت کے بارے میں ہری سنگھ نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اُسے وید جی کی بات یاد آئی۔ ''ہمارے اہنکار ہی ریت رواجوں کو جنم دیتے ہیں۔''

سردیاں بیتیں، گرمی کی رت آ گئی۔ وقت گزرتا رہا اور ایک روز ٹھاکر تیج بہادر نے دیکھا کہ ہری سنگھ دن بھر چلچلاتی دھوپ میں پوکھر والے موڑ کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گیا ہے اور کئی لوگ اسے اٹھا کر لا رہے ہیں۔ گرمی بہت تھی، منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، ہوش تو آ گیا مگر پھر ایسی چُپی سادھی کہ بولنے کا نام نہیں لیا۔ کئی ہفتے بعد وہ چپکے سے گھر سے نکلا اور دوڑتا ہوا وید جی کی بیٹھک کے پاس جا پہنچا۔ شہزاد خاں وہاں سے گزر رہے تھے۔ ''کیا بات ہے ہری سنگھ؟ کہاں بھاگے جا رہے ہو؟''

ہری سنگھ نے ہانپتے ہوئے وید جی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وید جی کے دروازے پر تالا لٹکا ہوا تھا۔ شہزاد خاں نے تالے پر جمی دھول کو دیکھا اور وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اس طرف بڑھ گئے جدھر سے ٹھاکر تیج بہادر گھبرائے ہوئے ہری سنگھ کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ٹھاکر تیج بہادر کے قریب پہنچ کر کے ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر ان کی گردن اونچی کی اور بولے۔ ''ٹھاکر صاحب ہری سنگھ.........؟''

''ہاں خاں صاحب...... ویسے تو وہ ٹھیک ہے، بس گھر میں بند رہتا ہے۔'' ٹھا کر تیج بہادر کی آواز اکھڑی اکھڑی سانسوں کے سہارے نکلی۔ ''وید جی کے دیہانت کی خبر سن کر بھی وہ گھر سے نہیں نکلا تھا، آج بہت دنوں بعد اچانک............''

پھر ان دونوں نے دیکھا کہ ہری سنگھ نے گلی سے ایک اینٹ کا آدھا اٹھا لیا ہے۔ ٹھا کر تیج بہادر اس کی طرف لپکنے ہی والے تھے کہ اینٹ کا ادھا وید جی کی بیٹھک کے بند کواڑوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا۔ پھر اس نے دوسرا ادھا اٹھایا پھر تیسرا اور بہت دیر تک وید جی کے دروازے پر اینٹیں برساتا رہا۔

وید جی کو گزرے مہینوں ہو گئے ہیں، ان کے گھر پر تالا پڑا ہے، مگر ہری سنگھ اکثر وہاں جاتا ہے، دروازے پر دو چار اینٹیں مارتا ہے اور واپس چلا آتا ہے۔ یوں تو وہ ٹھیک ہے لیکن گھر میں جب بھی لجّا کی بات نکل آتی ہے تو اس سے رہا نہیں جاتا اور سیدھا وید جی کے دروازے پر جا پہنچتا ہے۔ ٹھا کر تیج بہادر یہ تو نہیں سمجھ سکے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے مگر اس کی یہ حالت دیکھ کر انہوں نے اپنی بسنتی پگڑی پھر بکسے میں رکھ دی اور سفید صافہ باندھ کر وہ لجّا کے گاؤں رام نگر جا پہنچے۔

دونوں ٹھا کر ایک دوسرے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے تھے۔ دونوں کچھ کہنا چاہتے تھے مگر خاموش تھے۔ ہری سنگھ کے پتا کی آواز کپکپائی۔ ''ٹھا کر صاحب کیا انجانے میں کوئی بھول ہو گئی ہم سے۔''

''نہیں ٹھا کر صاحب بھول تو ہم سے ہوئی ہے، اب ہمیں چھما کرو۔''

ہری سنگھ کے پتا کچھ نہیں سمجھ سکے اور بول پڑے۔ ''لجّا............''

''لجّا؟ ٹھا کر صاحب لجّا کی ماں اسے میری گود میں چھوڑ کر پرلوک سدھار گئی تھی۔ بہت لاڈ سے پالا ہے میں نے اسے، ہنڈولا گھر میں ہوتا تھا اور جھولا باغ میں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ایک دن ان ہی ہاتھوں سے نرک میں جھونک دوں گا اسے۔''

''نرک میں؟ ٹھا کر صاحب یہ کیسی باتیں............''

''اور کیا اسے سوَرگ کہوں؟ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ اس پاگل کو ہماری بیٹی کے پلّے باندھ دیا۔ وہ تو بھلا ہو سندرا اور چودھری صاحب کا کہ دوسرے دن ہی یہاں آکر سب بتا گئے اور میں چپ چاپ اس نرک سے اسے نکال لایا ورنہ وہ تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔''

''مگر ٹھاکر صاحب وہ تو بچپن کی بات ہے۔اب تو ہری سنگھ ٹھیک ہے۔بس لجا کو......''

''ٹھیک ہے!اور بیاہ کے دوسرے دن جب میں لجا کو لینے گیا تو وہ پاگلوں کی طرح پورے دن پوکھر والی پلیا پر بیٹھا رہا۔اس پر کہتے ہو کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور جب میں بس سے اترا تو اس نے پتا ہے کیا کیا؟ میرے پیر چھوئے۔ٹھاکر کیا تم نہیں جانتے کہ ٹھاکروں میں داماد نہیں سسُر پیر چھوتے ہیں داماد کے۔کس طرح میرے آگے پیچھے لگا گھوم رہا تھا۔کبھی پانی لا کبھی چلم۔کبھی ہاتھ پاؤں دھلانے کو لوٹا لیے براجمان۔اور تو اور رات میں پاؤں دبانے بیٹھ گیا۔یہی ٹھاکروں کے ریت رواج ہیں کیا؟ کہتے ہو ٹھیک ہو گیا ہے وہ...... یہی ٹھیک ہوا ہے۔چٹھی پر چٹھی لکھتا ہے لجا کو۔گڑگڑاتا ہے مہرارو کے آگے۔لکھتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ٹھاکر کہتے ہیں اپنے آپ کو ٹھاکر۔آن ہے نہ بان۔بہو کو لینے آئے ہیں۔خود آن پہنچے ناک رگڑتے ہوئے۔''

لجا اوٹے کے پیچھے کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔رہا نہیں گیا،سسکتے ہوئے بولی۔

''پتا جی......''اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ ٹھاکر نیک سنگھ دہاڑے۔''تو جا اندر...... خبردار جو باہر نکلی۔مُنا کو چھوڑے یہاں کھڑی ہے۔وہ کوٹھری میں اکیلا پڑا ہے۔''

''مُنا؟ آپ نے خبر نہیں دی۔''

''ٹھاکر صاحب جب آپ سے کوئی ناتا ہی نہیں رہا تو خبر کیسی۔میں نہیں چاہتا کہ مُنا پر اس پاگل کا سایہ بھی پڑے۔''

''وہ پاگل نہیں ہے ٹھاکر صاحب...... اس نے جو کچھ کیا،وہ وید جی کے سکھائے ہوئے سنسکار تھے۔ان ہی کی سنگت کا اثر ہے۔انہوں نے ہی اپنے بڑوں کی عزت کرنا اور جھوٹی آن بان سے بچنا سکھایا ہے۔''

''ہوں...... بڑوں کی عزت؟ اور اپنی عزت......؟ اپنی عزت مٹی میں ملانا بھی وید جی نے ہی سکھایا ہوگا۔وید جی کے سنسکار سیکھ لیے اور اپنے سنسکار بھول گیا۔میں کہہ چکا ہوں،ٹھاکر صاحب آپ سے ہمارا اب کوئی ناتا نہیں۔'' ٹھاکر تیج بہادر کی کنپٹی پر جیسے کسی نے اینٹ کا اَدھا دے مارا ہو...... ''اینٹ کا اَدھا''—''وید جی کا بند دروازہ''—ہری سنگھ ایک کے بعد ایک اینٹ کے اَدھے چلا رہا ہے۔اب کچھ کچھ ٹھاکر تیج بہادر کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ہری سنگھ وید جی کے دروازے پر اینٹیں کیوں مارتا ہے۔وہ مڑے اور بھاری بھاری قدموں سے رام نگر

کی سرحد پار کرتے ہوئے واپس اپنے قصبے کی طرف لوٹنے لگے۔

لوٹ کر جب ٹھا کر تیج بہادر نے ساری بات ہری سنگھ کی بوا کو بتائی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ ہری سنگھ نے سنا تو بھاگ کر کوٹھری میں بند ہوگیا۔ بہت دیر دروازہ پیٹنے کے بعد جب کواڑ کھولے تو ٹھا کر تیج بہادر نے دیکھا کہ ہری سنگھ پاجامے کا ایک پائینچا پھاڑ کر اپنے گلے میں لپیٹے ہوئے ہے۔ کواڑ کھلتے ہی وہ کوٹھری سے باہر آ گیا۔

''بوا، لجا کے پتا جی کو پجامہ پہنا دو......'' پھر چاروں اور دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لجا کہاں ہے؟ ارے ہاں وہ تو اپنے پتا جی کے ساتھ گنگا نہانے گئی ہے''۔ پھر اس نے ایک چھلانگ ماری اور تیزی سے گلی میں دوڑ پڑا۔ اب وہ صبح سے شام تک پوکھر والے موڑ کی پلیا پر بیٹھا رہتا ہے اور ہر راہ گیر سے پوچھتا رہتا ہے۔

''بھیا گنگا نہا کے آ رہے ہو؟ لجا ملی تھی؟''

جواب نہ پا کر وہ بڑبڑاتے ہوئے اس طرف دیکھنے لگتا جہاں سے بس آتی دکھائی پڑتی۔ بس آتی اور اس کا منہ چڑاتی ہوئی گزر جاتی۔ اگر کوئی بس رکتی اور اس میں سے کوئی زنانی سواری اترتی تو وہ دوڑ کر اس سے لپٹ جاتا۔ ''لجا۔'' ایک بار تو اس کی بری طرح پٹائی شروع ہوگئی۔ وہ تو کہیے کسی بھلے مانس نے پہچان لیا۔ ''ارے یہ تو ہری سنگھ ہے...... پگلا......''

ٹھا کر تیج بہادر کئی بار رام نگر جا کر لوٹ آئے تھے مگر لجا کو نہ لا سکے، ہاں اتنی خبر ضرور لے آئے کہ لجا کا بیٹا منا اب پاٹھ شالا جانے لگا ہے۔ دن مہینے اور برس آتے جاتے رہے۔ موسم بدلے مگر اب کیا گرمیاں اور کیا سردیاں، ہری سنگھ کی حالت ایک جیسی رہنے لگی...... مُنا...... نہیں لجا...... ہاں لجا اب ایک چھوٹے سے بچے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس بچے کی شکل جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے لگتا کہ وہ اس کے انگنے میں ادھر ادھر ٹھمکتی گھوم رہی ہے۔ وہ ننھی سی بچی ہے یا سلونا سا بچہ...... پتا نہیں۔ مگر جب وہ اس کے قریب پہنچتا تو وہ کسی کونے میں دبک جاتی، بس وہ اپنا سر اسی کونے کی بھیت پر پٹکنے لگتا اور نڈھال ہو کر دھرتی پر چاروں خانے چت پڑ جاتا۔ اب کی گرمیوں میں وہ کسی بچے کا کچھا اٹھا لایا تھا۔ رات بھر چبوترے پر بیٹھا بیڑیاں پیتا رہا۔ کبھی کچھے کو جھاڑ پونچھ کر تہہ کر کے پاجامے کی انٹی میں اڑس لیتا اور کبھی چھپا کر بنیان کی جیب میں رکھ لیتا۔ رات بھر یہی کرتا رہا، صبح ٹھا کر تیج بہادر نے دیکھا کہ وہ چبوترے پر نہیں ہے۔ وہ گاؤں بھر میں نہیں تھا۔ بوا نے رو رو کر گھر بھر دیا۔ باپ نے آس پاس

کے تمام گاؤں کھنگال ڈالے مگر اس کا کہیں پتا نہ چلا۔ ہفتوں گزر گئے۔ ٹھاکر تیج بہادر کی امیدیں ٹوٹنے لگیں کہ اچانک انہیں رام نگر کا خیال آیا۔

ٹھاکر تیج بہادر اسٹیشن پر اتر کر کھیتوں کو پار کرتے ہوئے رام نگر کی طرف جا رہے تھے کہ دو آدمی آتے دکھائی پڑے۔ ''بھیا کیا رام نگر سے آ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

تیج بہادر نے گھبرا کر پوچھا۔ ''رام نگر میں ہری سنگھ ...... میرا مطلب ہے کوئی پاگل ......''

''پاگل ......؟'' دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

ٹھاکر تیج بہادر نے کہا۔ ''تم رام نگر والے ٹھاکر نیک سنگھ کو جانتے ہو؟''

ایک شخص کچھ سوچتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ''ارے یہ اس باؤلے کی بات کر رہے ہیں جس کا دایاں ہاتھ جلا ہوا تھا۔''

''ہاں ہاں وہی۔''

''ارے وہ۔ پہلے تو وہ کئی دن تک گاؤں کی دھرم شالا میں پڑا رہا پھر کچھ بچے ......'' راہ گیر بولتا رہا، ٹھاکر تیج بہادر بت بنے کھڑے رہے۔ ان کی خشک آنکھیں کھلی تھیں اور وہ سوچ رہے تھے بلکہ دیکھ رہے تھے کہ ہری سنگھ دھرم شالا میں پڑا ہے۔ اس کے گرد بہت سے بچے جمع ہیں۔ مُنّا ایک کونے میں سہما سمٹا کھڑا اسے تکے جا رہا ہے۔ ''مُنّا ......؟ ہاں یہ مُنّا ہی ہے۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تو کیا ہوا ......؟ کیا میں ہری سنگھ کو نہیں پہچانتا؟ ہری سنگھ کو پہچانتا ہوں تو مُنّا کو بھی پہچان سکتا ہوں۔'' ہری سنگھ رک رک کر کہہ رہا ہے۔ ''سدا بڑوں کا آدر کرو۔ جھوٹی آن بان اور جھوٹے ریت رواجوں سے بچنا سیکھو۔ ہمارے اہنکار ہی ریت رواجوں کو جنم دیتے ہیں۔'' مُنّا اس کی گود میں آن بیٹھا ہے۔ سامنے راہ گیر کھڑا کچھ بولے جا رہا تھا۔ اس کے شبد اینٹ کے اَدّھوں کی طرح ان کی کنپٹیوں پر پڑ رہے تھے۔

''پھر کہاں گیا وہ؟'' ٹھاکر تیج بہادر کے منہ سے نکلا۔

راہ گیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ بچوں سے ان کی ماؤں کے نام پوچھتا رہتا تھا۔ اور کسی ویدجی کی کہانی سنایا کرتا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ پاگل ہے۔ مگر ایک دن تو اس نے انرتھ ہی کر ڈالا۔ ٹھاکر نیک سنگھ کی بٹیا ......''

ٹھاکر تیج بہادر بولے۔ ''لجیا ......؟''

''نام تو ہمیں پتا نہیں ...... ہم تو گاؤں کے اسکول میں پڑھانے آتے ہیں''۔ وہ لمحے بھر کے لیے رکا، لیکن وہ لمحہ ٹھاکر تیج بہادر کو بہت طویل ہوتا محسوس ہوا اور پھر جب اس لمحے کا بلبلہ پھوٹا تو ان کے کانوں میں آواز آئی۔ ''وہ باولا ٹھاکر صاحب کے ناتی کو لے کر بھاگ نکلا۔ وہ تو کہو کچھ لوگوں نے دیکھ لیا۔ بڑا ہو ہلا ہوا مگر اس نے بچے کو نہ چھوڑا۔ لوگوں نے پیچھے سے اینٹیں اور ڈھیلے مارنے شروع کیے۔ پیٹھ سے خون نکلنے لگا مگر رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بھگوان کا کرنا تھا ادھر سے سرپنچ آ رہے تھے۔ یہ ماجرا دیکھا تو گھما کر لاٹھی اس کے سر پر دے ماری تب جا کر وہ گرا۔''

ٹھاکر تیج بہادر نے آنکھیں موند لیں، اور بند آنکھوں سے دیکھا کہ ہری سنگھ کے سر سے خون بہہ رہا ہے، ناک سے پھوار پھوٹ پڑی ہے اور وہ بچے کو گود میں چھپائے زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے۔

ٹھاکر تیج بہادر کے پیروں کے نیچے زمین کانپنے لگی، آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر بولے۔ ''تو کیا وہ مر گیا؟''

''ہاں وہ تو وہیں مر گیا تھا۔ اگر نہ مرتا تو بچے کا جانے کیا حال کرتا۔ چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے اس کے ہاتھ سے بچے کو چھڑایا۔''

ٹھاکر تیج بہادر کا دل دھک سے رہ گیا جیسے وید جی کے دروازے پر کسی نے اینٹ کا ادھا دے مارا ہو۔ انہیں لگا کہ وید جی کی بیٹھک کا دروازہ اکھڑ کر دور جا گرا ہے اور اندر وید جی کی لاش پڑی سڑ رہی ہے۔ وہ شخص بولے جا رہا تھا۔ ''اس کا کریا کرم بھی ٹھاکر نیک سنگھ نے ہی کیا تھا۔ بڑی آن بان کے ساتھ کیا تھا اس کا انتم سنسکار۔ بڑے ہی نیک آدمی ہیں بے چارے''۔

دوسرا شخص جو دیر سے خاموش تھا بول پڑا...... ''ارے بھئی وہ پاگل تھوڑی تھا وہ تو جادوگر تھا۔ مرنے کے بعد بھی اس کا جادو چل رہا تھا۔''

ٹھاکر تیج بہادر نے اس کے چہرے پر نظریں گڑا دیں۔

''پتا ہے کیا ہوا؟''

''کیا؟'' ٹھاکر تیج بہادر کے منہ سے نہیں پورے وجود سے آواز نکلی۔

''ٹھاکر جی کا ناتی اس کی جلتی چتا......''

''جلتی چتا میں کود پڑا؟''

''نہیں، کودا تو نہیں مگر اسے جلتا دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔''

''بے ہوش ہو گیا؟ ہری سنگھ کا بچہ بے ہوش ہو گیا۔ مطلب ہری سنگھ مرا نہیں، وہ زندہ ہے۔ عجب لوگ ہیں کہتے ہیں مر گیا۔ وید جی کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں کہ مر گئے۔''

ٹھاکر تیج بہادر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا انہیں محسوس ہوا کہ وید جی کی بیٹھک کا دروازہ پوری طرح سلامت ہے اور اس کا ایک پٹ جس پر ابھی اینٹ کے ادھے کے سرخ نشان موجود ہیں کھلا ہوا ہے اور ہری سنگھ کا بچہ بیٹھک سے باہر نکل کر اپنے ننھے منّے ہاتھوں سے ان نشانوں کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ''بچہ بے ہوش ہو گیا یعنی وید جی زندہ ہیں۔'' وہ بڑبڑا رہے تھے۔ دونوں راہ گیروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ سمجھے بغیر وہاں سے چل دیے۔

''ہری سنگھ زندہ ہے..........'' ٹھاکر تیج بہادر پھر بڑبڑائے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی پگڑی اتاری، اس سے منہ کا پسینا پونچھ کر اطمینان کی سانس لی اور واپس اسٹیشن کی طرف لوٹ پڑے۔

کھوکھلا پہیا

'ہم تو خدا کے بنائے ہوئے پہیے ہیں، کھوکھلے پہیے .... وہ جس طرح چاہتا ہے گھماتا ہے اور اگر ہم گھومنے سے انکار کریں ....

انکار؟

انکار کیسے کر سکتے ہیں، ہمیں تو گھومتے ہی رہنا ہے، کبھی مرضی سے اور کبھی مرضی کے بغیر—'

وہ ہر شام دھندے پر نکلنے سے پہلے یہی سوچا کرتا۔

اس نے لونی لگی کچی دیوار میں ٹھکی کھونٹی سے پرانا جھولا اتارا اور دھندے کے اوزار ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ہتھوڑی، چھینی، سنڈاسی، چھوٹی سی کدال اور ایک آنکڑا۔ ''سب ٹھیک ہے''۔ سب ٹھیک تھا مگر اس نے ایک بار پھر جھولے میں جھانک کر دیکھا۔ غروب ہوتے

سورج کی مدھم روشنی میں اوزار دکھائی دیے۔ آنکڑا منہ اٹھائے اسے تک رہا تھا۔ اسے لگا کہ ابھی آنکڑا اُچھل کر اس کی قمیص کے دامن میں پھنس جائے گا۔ پھر وہ اور اس کا ننگا بدن .... ! سوکھی کھال کے اندر پسلیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔ وہ سہم گیا اور جلدی سے جھولا بند کر دیا۔

اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے، اسی لیے آنکڑے سے ڈر جاتا ہے۔

وہ دھندے پر جا رہا ہے۔ بغل میں جھولا اور ہاتھ میں پتلی چھڑی ہے۔ اسے کدھر جانا ہے کیا معلوم؟ ابھی دو چار گاؤں یوں ہی بھٹکے گا پھر آدھی رات ہو جائے گی، کام بن گیا تو ٹھیک، ورنہ صبح ہوتے ہوتے گھر واپس۔

گھر؟

گھر تو بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا تھا۔ تو کیا ہوا در و دیوار تو سلامت ہیں۔'

اسے دور کوئی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بلب چمک رہا ہے۔

'یہ تو پہیا ہے، بلکہ گاڑی ہے۔'

ایک بچے نے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے دو پہیوں میں ڈنڈا باندھ کر گاڑی بنا رکھی تھی۔ دونوں پہیوں کے بیچ بیٹری کے دو سیل پھچیوں میں سُتلی سے لپیٹ کر رکھ دیے تھے اور بجلی کے لمبے تار میں چھوٹا بلب لگا کر ڈنڈے میں لٹکا دیا تھا۔

'واہ رے خدا ہم سچ مچ کھوکھلے پہیے ہیں، تو جس طرح چاہتا ہے ہمیں گھماتا ہے۔'

اسے یاد آیا بچپن میں بنجاروں والے کنویں پر ایک پہیا ملا تھا جو بالکل کھوکھلا تھا۔ عام پہیوں سے الگ پائپ کا بنا یہ پہیا شاید کسی پرانی مشین کا بڑا پرزہ ہو، مگر یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ کھوکھلا کیوں تھا، کیا ہمیشہ سے کھوکھلا تھا؟ کھوکھلا تھا بھی یا نہیں؟ یا پھر ......!

اس نے دیکھا کہ بچہ بلب لگی گاڑی کو بہت آہستہ آہستہ ڈھکیل رہا ہے۔

'ارے اس میں تو لوہے کے دو تار بھی بندھے ہیں۔'

بچے نے ایک تار کھینچا۔ گاڑی کے دونوں پہیے ایک جانب مڑ گئے۔ دوسرا تار کھینچا تو گاڑی رک گئی۔ یہ بریک تھا۔

'ہاتھ سے ڈھکیلنے پر اور وہ بھی اتنا آہستہ، پہیے کو بریک کی ضرورت؟'

یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

'کیا یہ سمجھنے کے لیے، بچہ بننا پڑے گا؟'

'مگر کیوں؟ کیا وہ کبھی بچہ نہیں تھا؟'

بچپن میں جب وہ زنگ آلود لوہے کے کھوکھلے پہیے کو مکا کے ٹھیرے سے ڈھکیلتے ہوئے بہت تیز دوڑتا ہوا مدرسے سے گھر واپس آتا تو اس کے پہیے کو نہ تو کہیں بریک کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہ آج کی طرح دھیمے چلتا۔ اگر کبھی وہ اس پرانے زنگ آلود کھوکھلے پہیے کو آہستہ چلانے کی کوشش کرتا بھی تو پہیا دوچار چکر لے کر گر جاتا۔ پہیے کے سہارے وہ کتنی جلدی گھر واپس آ جاتا تھا۔ جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کے بعد کی نسل نے سرکنڈے یا مکا کے ٹھیرے کے بجائے لوہے کے آنکڑے بنا لیے اور سب پہیے دھیمے چلنے لگے۔ جب جوان ہوا تو پہیوں میں آنکڑے اس طرح جڑ دیے گئے کہ پہیے اپنی فطری رفتار کھو بیٹھے......

...... اور اب جب کہ وہ بوڑھا ہے، موڑنے اور بریک لگانے کے لیے تار بھی کس دیے گئے ہیں۔ اب اسے بچوں کے ان پہیوں سے نفرت ہونے لگی۔ پہیوں سے ہی کیوں، قصبے کی زمین سے اگتی ہوئی نئی نئی بلند عمارتوں سے بھی تو اسے نفرت ہے۔ جب عمارتیں کم تھیں تو پہیے تیز چلتے تھے اور جب پہیے تیز چلتے تھے تو اس کا دھندا بھی اچھا چلتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے، ایک روز وہ پوکھر کے کنارے اداس بیٹھا تھا کہ شکورا تیلی کا جنازہ گزرا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ جب جنازہ قبرستان کے احاطے میں داخل ہو گیا تو ایک عمر رسیدہ تجربے کار شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کسی دھندے سے لگا ہے؟''

بولا کچھ نہیں بس نفی میں گردن ہلا دی۔

''چل اٹھ، یہ لے جھولا۔''

وہ اٹھا، شکورا تیلی کی قبر کھود کر تختہ ہٹایا اور اس میں آنکڑا ڈال دیا۔ چند ہی لمحوں میں بہت قیمتی اور ملائم کپڑا اس کے ہاتھوں میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، وہ کفن کھسوٹنے میں ماہر ہو گیا۔ رات ہی رات میں دس دس کوس کے مردوں کے کفن کھسوٹ لاتا۔

''تیرا نام کیا ہے؟'' اس نے گاڑی والے بچے سے پوچھا۔

بچے نے جواب دیا۔ ’’سلیم۔‘‘

’’تو حاجی وحید کا ناتی ہے؟‘‘

بچہ کچھ کہے بغیر، آہستہ آہستہ گاڑی ڈھکیلتا آگے بڑھ گیا۔

’حاجی وحید!‘ ہاں وہی وحید پہلوان، جن کی اب دو منزلہ عمارت ہے، یہیں ان کا کچا مکان تھا۔ اسارے میں اپنے چیلوں کو لیے بیٹھے رہتے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانا پینا چلتا رہتا۔ کبھی بادام، کبھی دیسی گھی میں بنا انڈے کی زردی کا حلوا۔ دیسی گھی تو وہ پانی کی طرح اوک سے پی جاتے۔ پھر انہوں نے اسارے کی جگہ بیٹھک بنوالی اور دیسی گھی پینا بند کر دیا۔ جب پچھلا کوٹھا تڑوا کر دو کمرے بنوائے تو زردی کا حلوا بھی بند ہو گیا۔ اور جب ان کی لکڑی کی ٹال آرا مشین کا کارخانہ بنی تو چیلے چپاٹے غائب۔ اب ان کے بچے شہر میں پڑھتے تھے اور وہ بیٹھک میں پڑے کھانستے رہتے تھے اور ایک دن ان کا انتقال ہو گیا تو اس نے کفن چرانے کے لیے ان کی قبر میں آنکڑا ڈالا۔

’’آج تو بہت قیمتی کپڑا ملے گا۔ اس دفعہ کپڑا رام سروپ بزاز کے ہاں نہیں بیچوں گا۔ بے ایمان بہت کم پیسے دیتا ہے۔ مگر رام سروپ بھی کیا کرے، اب قبر سے نکلتا ہی کتنا باریک اور خراب کپڑا ہے۔ جس دن اخبار میں یہ خبر چھپی کہ ہمارا قصبہ تحصیل ہو گیا ہے، اس دن دل شاد پٹواری کی قبر سے کتنا مہین کفن نکلا تھا۔ رام سروپ نے تو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ مگر پھر مان ہی گیا۔ آخر تھا تو اسی کی دکان سے خریدا ہوا۔ لیکن حاجی وحید کے بیٹوں نے تو بڑا قیمتی کفن پہنایا ہوگا۔‘‘

اس نے چھڑی میں آنکڑا کسا اور تختہ ہٹا کر قبر میں ڈال دیا۔ دو تین جھٹکے مارے پھر آہستہ آہستہ کھینچا۔ دیکھا تو کپڑا کیا تھا چیتھڑا تھا۔

’رام سروپ تو دو آنے کو بھی نہیں پوچھے گا۔‘

اس وقت اسے یاد آیا کہ استاد نے بتایا تھا۔ بہت دنوں کی بات ہے جب اس قصبے میں سب مکان کچے تھے اور برسات میں ہر آدمی کا چھپر ٹپکتا تھا۔ اس وقت استاد کے دادا نے جس قبر سے کفن چرایا تھا، اس میں سونے چاندی کے تاروں سے بنا ایک دوشالہ نکلا تھا۔

بچہ گاڑی لے کر حاجی وحید کی دو منزلہ عمارت میں گھس گیا۔ کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ ’ابھی اسے کئی گاؤں گھومنا پڑے گا، شاید کہیں موت ہوئی ہو۔‘ خیرات پور، نارائن پور اور

گنگا گڑھ ہوتا ہوا جب ویرپور کے قبرستان کے قریب پہنچا تو قبرستان میں روشنی نظر آئی۔ سکون کی سانس لی اور قبرستان کے باہر پلیا پر بیٹھ گیا۔ لوگ مردے کو دفن کر کے واپس جا رہے تھے۔ اس نے چھپ کر واپس جاتے لوگوں کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر نہ غم کے آثار تھے اور نہ موت کا خوف۔

'یہ کون سی جگہ ہے؟ یہ سچ مچ ویرپور کا قبرستان ہے یا وہ کسی اور دنیا میں آن بھٹکا ہے۔'

چاروں طرف نظریں گھمائیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''کوئی بھی جگہ ہو مجھے کیا؟ ہے تو قبرستان ہی۔ اور قبرستان بھی نہ ہو تو کیا ہوا، قبر تو ہے، جس میں ابھی ابھی کچھ لوگ مردے کو دفنا کر واپس گئے ہیں۔''

'چنبیلی مہک رہی ہے، لگتا ہے امیروں کا قبرستان ہے، اور جو لوگ دفنا کر گئے ہیں ان کے کپڑوں سے بھی عجیب عجیب خوشبوئیں نکل رہی تھیں۔''

اس نے جھولے کو ٹٹولا، آنکڑا نکال کر چھڑی میں لگایا اور تازہ قبر کی تلاش میں چل دیا۔ قبر ملی تو اس پر ببول کی ٹہنی کے بجائے گلاب کی شاخ اڑسی ہوئی تھی اور مٹی کیوڑے سے مہک رہی تھی۔ اس نے کدال نکالی اور قبر کے ایک کونے کو کھودنے لگا۔ وہ جتنا کھودتا خوشبو تیز ہوتی جاتی۔ اچانک ''ٹن'' سے آواز ہوئی۔ وہ اچھل گیا۔ اسے لگا کہ کدال لوہے کے کھوکھلے پیپے سے جا لگی ہے۔ کدال پھر ماری، آواز اور تیز ہوئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''اے خدا میں کہاں آن پہنچا ہوں؟ یہ لوگ کون تھے جو مردے کو دفن کر گئے ہیں اور یہ آواز.................. یہ آواز کیسی ہے، کیا مٹی پتھرا گئی ہے یا میری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔''

اس نے ہمت کی اور ایک بار پھر کدال ماری۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ تختے کی جگہ پتھر کی پٹیا رکھی ہے۔

'آج تو برسوں بعد حسرت پوری ہوگی، کسی امیر کی قبر ہے، شاید سونے چاندی والا دوشالہ بھی ہو۔'

اس نے ہاتھ سے پتھر کو کھسکانا چاہا مگر پتھر بہت بھاری تھا۔ وہ یہی تو چاہتا ہے کہ پتھر

بہت بھاری ہو۔ ہلکا پھلکا پتھر رکھنے والے مردے کو دوشالہ کیا اڑھائیں گے۔'

اب اس نے جھولے سے چھینی ہتھوڑی نکال کر پتھر میں چھید کرنا شروع کر دیا۔ مٹی میں دبے پتھر کو کاٹنے کی بھنچی بھنچی آواز قبرستان کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ جب آواز تیز ہوتی ہے تو وہ کانپ جاتا ہے۔

''کون؟''

'ارے یہ تو میرا وہم ہے۔ یہاں اندھیرے کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ بستی یہاں سے کوس بھر دور ہے۔'

پتھر بہت موٹا ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہو چکا ہے۔ قبر کی ساری مٹی کھود کر پتھر ہٹا دینا زیادہ آسان ہے —

'مگر پھاوڑا.........؟'

اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا کہ شاید گورکن اپنا پھاوڑا بھول گیا ہو۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ایک سیاہ غار......................آنکھوں کے سامنے گول گول دائرے تیرنے لگے اور سر چکرانے لگا۔ پھر اس نے کدال اٹھائی اور پوری طاقت سے پتھر کے کونے پر دے ماری۔ پتھر چیخ کر ٹوٹ گیا۔ اس نے آنکڑے والی چھڑی آڑے ترچھے بڑے سے چھید کے اندر ڈال دی۔ مگر اس کے پاؤں الٹے پڑ رہے تھے۔ بیری کے سوکھے جھاڑ نے اسے آ دبوچا۔

'اف اتنا خوف؟ آخر بیس سال سے یہی کام کر رہا ہوں۔'

اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ دل کو تسلی دی۔

'یہ تو خوشی سے کانپ رہے ہیں، خوف کیسا۔'

وہ کپکپاتے ہاتھوں سے آنکڑے میں کفن پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکڑا بار بار کسی چیز میں لگ کر پھسل جاتا۔

'شاید دوشالہ بہت دبیز ہے۔'

اس نے بڑی مہارت کے ساتھ زور لگا کر آنکڑے کے منہ کو کپڑے میں اٹکانے کی کوشش کی۔ محسوس ہوا کہ کوئی موٹی سی چیز آنکڑے میں پھنس گئی ہے۔ اس نے کھینچنا

چاہا مگر آنکڑا نہیں کھنچا۔

'بہت موٹا کپڑا ہے ـــــ'

پھر زور سے جھٹکا دیا۔ اب آنکڑا پتھر کے چھید سے باہر آ چکا تھا۔..........

آنکڑے کو چھوا'

تو اس کے ہاتھ میں کوئی لجلجی سی چیز آ گئی۔ یہ مردے کے جسم کی نچی ہوئی کھال تھی۔ وہ چیخ پڑا اور بے تحاشا بھاگنے لگا۔ وہ اپنی سمت بھول چکا تھا۔ وہ کب سے بھاگ رہا ہے؟ برسوں سے ......صدیوں سے ....؟ یہ تو یاد نہیں مگر اب وہ جہاں آن پہنچا ہے۔ جگمگاتی روشنیوں والا کوئی بہت بڑا شہر ہے۔ اسے دور سے دھواں اگلتی چمنیاں نظر آ رہی ہیں۔ چمنیاں لوہے کی ہیں، مگر کھوکھلے پیپے والے زنگ آلود لوہے کی نہیں۔

اب وہ شہر کے باہر عیسائیوں کے قبرستان کے قریب کھڑا ہے اور بری طرح ہانپ رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ شہر کی جانب سے گیس کی لالٹینوں کے ساتھ برات آ رہی ہے۔

'برات؟ نہیں یہ تو عیسائیوں کا جنازہ ہے ــ'

اسے اپنے استاد کی بات یاد آئی۔

''جب کوئی عیسائی مرتا ہے تو اسے سونے کی زنجیر، گھڑی اور قیمتی کپڑے پہنا کر تابوت میں بند کیا جاتا ہے ــ''

'کیا سچ مچ آج بھی سونے کی زنجیر اور گھڑی پہناتے ہیں عیسائی لوگ؟'

'ہاں کیوں نہیں ــ'

اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چمکتا ہوا ایک بڑا ستارہ نظر آیا۔

'ارے یہی تو ہے اپنی قسمت کا ستارہ۔ کتنے دنوں بعد چمکا ہے ـــــ'

اطمینان کی سانس لی اور قبرستان کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

'ان لوگوں کے چہروں پر خوف کیوں ہے ؟'

'شاید موت کا خوف ہو ـــ'

'مگر کسی کے چہرے پر رنج والم کا نام ونشان بھی نہیں ــ'

'استاد نے بتایا تھا کہ عیسائی کسی کی موت پر روتے پیٹتے نہیں ہیں۔ بس کالے کپڑے پہن لیتے ہیں۔'

اس نے دیکھا کہ قبر میں اتارتے وقت تابوت ایک طرف کو جھک گیا ہے۔

'شاید تابوت کے اندر بہت بھاری بھرکم مردہ ہے جو قیمتی سامان کے بوجھ سے ادھر اُدھر لڑھک رہا ہے۔'

اب تابوت مٹی سے ڈھکا جا چکا تھا اور سینے پر کراس کا نشان بناتے لوگ قبرستان سے باہر نکل گئے تھے مگر دو چار لوگ اب بھی وہاں کھڑے تھے۔

'ارے یہ لوگ اس طرح چپکے چپکے کیا باتیں کر رہے ہیں؟'

اس نے کان لگا کر سننا چاہا مگر باتیں اتنی آہستہ ہو رہی تھیں کہ شاید بات کرنے والا بھی اپنی بات نہیں سن پا رہا تھا۔ سننے کی بہت کوشش کی مگر وہ صرف اتنا سن پایا

"اب کوئی فکر کی بات نہیں سب یہی سمجھیں گے کہ........."

پھر ان میں سے ایک نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر سامنے کھڑے شخص کو دیے۔ دوسرے نے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی باقی لوگ ادھر اُدھر چلے گئے۔ وہ جلدی سے قبر کے پاس پہنچ گیا اور کدال سے مٹی کھودنے لگا۔ کدال سے کھود کھود کر اس نے قبر کی ساری مٹی کو پھوکا کر دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں تابوت نظر آ گیا۔ مٹی ہٹائی اور تابوت کو چھو کر دیکھا۔ اس پر پیتل کی پتیاں جڑی ہوئی تھیں۔

"اُف تابوت بھی اتنا قیمتی !"

اس کے منہ سے نکلا۔ اپنی ہی آواز کی بازگشت اجنبی آوازوں میں تبدیل ہو کر اسے سنائی دی تو اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا اور جلدی سے تابوت کی ایک کیل اکھاڑ دی۔ پھر کیل کو آنکھوں کے قریب لا کر اس طرح دیکھنے لگا کہ کہیں یہ کیل سونے کی تو نہیں۔ مگر رات کی تاریکی میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔

'اندر کتنا خوبصورت مردہ ہوگا .... تندرست، صحت مند، گھڑی اور سونے کی زنجیر پہنے اور دوشالہ .... دوشالہ نہیں بھی ہوا تو سونے کی زنجیر تو ہوگی ہی ...... جب وزیر خاں حج کر کے لوٹے تھے تو انہوں نے ایک ہاتھ کے بجائے دونوں ہاتھوں میں گھڑیاں پہن رکھی تھیں

اور پھر عیسائیوں کی تو بات ہی کچھ اور ہے، چار چار گھڑیاں بھی پہنا سکتے ہیں مردے کو۔'

وہ ہاتھوں میں چار چار گھڑیاں پہنے، گلے میں سونے کی موٹی زنجیر ڈالے اور سونے چاندی کے تاروں سے بنا، نگینے جڑا، بھاری دوشالہ اوڑھے بڑے بڑے شہروں کی چوڑی سڑکوں پر ٹہل رہا ہے۔

بڑے سے بڑا اسنار بھی اس کی زنجیر اور دوشالہ خریدنے کو تیار نہیں۔ خریدے بھی کیسے؟ کس کے پاس ہے اتنا روپیہ؟ اتنا قیمتی سامان تو کوئی راجا ہی خرید سکتا ہے۔ اسے لگا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہے۔

"پولیس !"

"نہیں ___"

اس نے دیکھا کہ نہ اس کے کندھوں پر دوشالہ ہے اور نہ گلے میں سونے کی زنجیر۔ وہ تابوت کے پاس تنہا بیٹھا تھا۔ سامنے زمین پر قبر کی مٹی کے بچے کھچے ڈھیلے بکھرے پڑے تھے اور آسمان پر بڑا تارہ چمک رہا تھا۔ اس نے بہت احترام سے تابوت پر ہاتھ پھیرا۔ پیتل کی پتر کے نقوش ابھرے محسوس ہوئے تو اس کی اکھڑی ہوئی سانسیں قابو میں آنے لگیں اور وہ انگلیوں کو ڈھیلا کر کے دھیرے دھیرے تابوت کو سہلانے لگا۔

'اب دیر کرنے سے کیا فائدہ.........کھل جا سم سم۔'

اس نے تابوت کے اوپر کا تختہ ہٹایا اور جلدی سے مردے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا مگر جب اس کے ہاتھ مردے کے بجائے تابوت کے نچلے تختے پر جا لگے تو وہ لرز گیا۔ تابوت خالی تھا۔ بالکل خالی.........وہ چیخا اور پھر چکرا کر اس طرح گر گیا جیسے کسی نے اسی کی کدال اس کے سر پر دے ماری ہو۔

وہ اتنا ہلکا کیوں ہو گیا ہے؟ شاید اس کے جسم سے بہت کچھ نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ وہ اندر سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ اس کی پسلیاں گلنے لگی ہیں۔ ایک ایک کر کے سب گلتی جا رہی ہیں، گوشت بھی سڑ چکا ہے اور کھال پر زنگ لگ گیا ہے۔ اب وہ بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔

'اے خدا جو باہر ہے وہی اندر ہے، اور جو.........'

اس نے سوچا اور وہاں سے بھاگنے کے لیے زور لگایا۔ وہ بھاگ تو نہ سکا مگر زمین پر لڑھک پڑا اور اتنا تیز لڑھکنے لگا کہ اگر رکنا بھی چاہے تو نہ رک سکے۔ وہ لڑھکتا رہا۔ چھوٹے بڑے آڑے ترچھے راستوں پر لڑھکتا رہا۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ زنگ آلود لوہے کا کھوکھلا پہیا ہے اور کوئی شخص اسے مکّا کے ٹھیرے سے مار مار کر تیزی سے لڑھکا رہا ہے۔ وہ لڑھکتا رہا' اس مردے کی مانند جو تابوت میں تھا ہی نہیں۔

باغ کا دروازہ

گرمیوں کی تاروں بھری رات نے گھر کے بڑے آنگن کو شبنم کے چھڑکاؤ سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ جیسے ہی دادی جان نے تسبیح تکیے کے نیچے رکھی نوروز کود کر ان کے پلنگ پر جا پہنچا۔

''دادی جان جب سبھی شہزادے باغ کی رکھوالی میں ناکام ہو گئے تو چھوٹے شہزادے نے بادشاہ سلامت سے کیا کہا......؟''

''نوروز تو اب بڑا ہو گیا ہے۔ کہانیاں سننا چھوڑ......''

''دادی جان یہ کہانی کہاں ہے، یہ تو ہمارے ہی شہر کے باغ کا قصہ ہے۔ باغ کوٹھی والا باغ۔''

''ہاں میرے لال، یہ ہمارے شہر کی بھی داستان ہے اور ان شہروں کی بھی جو ہم نے نہیں دیکھے ہیں۔''

''کیا چھوٹا شہزادہ بھی باغ کی رکھوالی میں ناکام ہو جائے گا؟''

''اچھا سُن .... لیکن ہنکارے بھرتے رہنا۔''

''تو چھوٹے شہزادے گل ریز نے بادشاہ سلامت سے کہا۔ بابا حضور مجھے بھی ایک موقع دیجیے۔ بادشاہ نے لختِ جگر پر نگاہ کی اور بولے۔ نہیں جانِ پدر، شرط مشکل ہے اور تو عزیز۔ اگر تیرا پہرا بھی ناکام ہوا تو اس وطن کے آخری ستارے کو بھی شہر بدر ہونا پڑے گا۔ شہر خالی ہو چکا ہے۔ تیرے پانچوں بھائی بھی میری آنکھوں کو ویران کر گئے ہیں۔ باغ پر کسی دیو کا سایہ ہے جو سخت نگہبانی کے باوجود صبح ہوتے ہوتے سارے چمن کو اجاڑ دیتا ہے۔ پہرے کی کامیابی پر آدھی بادشاہت دینے کا وعدہ ہے۔ مگر تجھے کیا؟ اے میرے خوش بخت فرزند تو، تو پوری سلطنت کا مالک ہے۔ نہیں بابا حضور، میں نے بیڑا اٹھایا ہے، اب آپ حکم دیجیے۔ جیسی تیری مرضی، اور بادشاہ نے شہزادے گل ریز کو رخصت کیا۔ شہزادے نے اپنے ساتھ ایک چاقو اور شیشی میں پسی ہوئی سرخ مرچیں لیں اور باغ کی سمت روانہ ہوا۔ باغ کے دروازے میں داخل ہو، دروازہ بند کر، پہرہ دینے لگا۔ جب رات آدھی ہوئی اور جھپکیاں آنے لگیں تو اس نے چاقو نکال، اپنی کنی انگلی تراش، اس میں مرچیں بھر لیں۔ نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی اور سحر نمودار ہونے لگی۔ اسے یاد آیا کہ عرصہ ہوا اس باغ میں ایک فقیر نے ڈیرا ڈالا تھا اور کسی بات پر خوش ہو کر اس قلندر نے شہزادے کو بتایا تھا کہ اس باغ پر ایک دیو کا سایہ ہے۔ جو بھی اس کی پاسبانی کرے گا وہ پو پھٹتے پھٹتے سو جائے گا۔ اگر کسی صورت جاگتا رہ جائے تو دیو پر فتح پائے گا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہے، ایک لحیم شحیم دیو باغ کی فصیل لانگ کر داخل ہوتا ہے اور پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا پھل دار درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ بس شہزادے نے دیکھا اور پلک جھپکتے ہی اس کی دُم سے لٹک گیا۔ دیو ڈال ڈال تو شہزادہ پات پات۔ دیو نے کہا، میں سیر ہوں، شہزادہ بولا، میں سوا سیر۔ دیو پلٹا، شہزادہ کود کر اس کی پیٹھ پر ....''

''سو گیا کیا؟''

''نہیں دادی جان۔''

''اچھا تو سن۔'' اور پھر وہ بہت دیر تک دیو اور شہزادے کے داؤ پیچ بیان کرتی رہیں۔

''آخر کار دیو کی ہار ہونی تھی سو ہوئی۔ بولا تو جیتا میں ہارا۔ اب مجھے چھوڑ، اس کے عوض تجھے

سات بال دوں گا، جو وقت ضرورت تیرے کام آئیں گے۔ جب مصیبت پڑے تو ایک بال جلا دینا، باقی بُرے وقت کے لیے رکھ لینا۔''

یہ کہہ کر دادی جان نے اطمینان کی سانس لی، اس کے بعد سانسوں میں آواز پیدا ہونے لگی اور وہ سو گئیں۔ نوروز رات کو کہانی کی اگلی کڑی سنتا اور دن میں باغ کوٹھی کے چکر لگاتا۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا، پھر ایک دن نوروز نے دادی جان سے کہا۔

''آج کہانی پوری کر کے ہی سوئیے گا دادی جان۔''

''اچھا تو کہاں تک پہنچے تھے؟'' لمحے بھر سوچ کر خود ہی قصے کو مختصر اً دہرانے لگیں۔

''شہزادے نے بادشاہت نہیں لی اور اپنے بھائیوں کی تلاش میں راج پاٹ چھوڑ کر چل پڑا۔ بھائی ملے مگر مارے حسد کے اسے سائیس بنا کر رکھا۔ بھائی سویرے نکلتے شام کو لوٹتے اور بہت فکرمند رہتے۔ ایک شب بھائی سمجھے وہ سو گیا ہے مگر وہ جاگ رہا تھا، بھائیوں کو کہتے سُنا کہ آج پھر منادی ہوئی ہے کہ جو شخص برج کی محراب میں بیٹھی شہزادی گلشن آرا کو محل کے پہلے دروازے سے پھولوں کی گیند مارنے میں کامیاب ہو جائے گا وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گی۔ اشتیاق بڑھا، چھپ کر بھائیوں کے پیچھے پیچھے چل دیا اور یہ ماجرا دیکھا کہ دور دراز ملکوں سے آئے شہزادے اپنی اپنی قسمت آزما رہے ہیں مگر شہزادی جس بارہ دری میں بیٹھی ہے وہاں ہوا کچھ اس رخ سے چلتی ہے کہ شہزادی تک گیند کا پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسے طلسمی بالوں کا خیال آیا۔ ایک بال جلایا، سبز گھوڑا، سبز جوڑا تیار اور پھولوں کی ایک گیند جو شہزادے کے اشارے کی تابع دار تھی، ہاتھ میں آ گئی۔ کامیابی ملی، مگر وہ گھوڑے کو لے کر نظروں سے اوجھل۔ دوسرے دن سرخ جوڑا، سرخ گھوڑا اور گیند۔ گل ہزارہ کی گیند شہزادی گلشن آرا کے رخِ روشن کو چھوتی اور بکھر جاتی۔ یہ سب اس طرح ہوتا جیسے بجلی کوند گئی ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے شہزادہ نظروں سے غائب۔ ساتویں روز سفید جوڑا پہنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر جب وہ گیند مار کر فرار ہوا تو شہزادی کے منصوبے کے مطابق اس کے داہنے پیر کو محل کے سپاہیوں نے زخمی کر دیا۔ بس شہر بھر میں زخمی پیر والے شخص کی تلاش شروع ہوئی اور ایک سرائے کے پچھواڑے سائیس کے بھیس میں شہزادہ گرفتار ہوا۔ شہزادی کی ضد کے نتیجے میں شادی تو ہو گئی مگر بادشاہ سلامت کو کم رتبہ رشتہ پسند نہیں آیا۔ دونوں کو دو دھڑی ناج اور ایک اشرفی دے کر سلطنت سے نکال دیا۔ ان دونوں

نے ایک دنیا بسائی۔ دنیا بسانے کا وہی پرانا طریقہ۔ ایک اشرفی کے کچھ چاول، کچھ ریشم کے دھاگے، کچھ زری کے تار اور کچھ اوزار۔ چاول کے دانے میدان میں ڈالے۔ رنگ برنگی چڑیاں آئیں، پر ٹوٹے، ان کو سمیٹ کر پنکھا بنایا۔ شہزادہ بازار میں بیچ آیا۔ پھر چاول کے دانوں، ریشم کے دھاگوں اور زری کے تاروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ہر روز کئی پنکھے تیار ہونے لگے۔ پھر فرشی پنکھے، چھت سے لٹکنے والے پنکھے اور دیوار کے قالین بننے لگے۔ کاروبار بڑھا تو ایک گڑھی نما قلعہ بنوایا، یوں ان کی دنیا آباد ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی اور پھر ایک باغ لگایا۔"

"بس دادی جان۔ آگے کا قصہ مجھے معلوم ہے۔"

"تجھے کیسے معلوم؟"

"ہمارے ہی شہر کی تو کہانی ہے۔ باغ کوٹھی کے دربان شیز فام نے مجھے سنائی تھی۔ اور دادی جان وہ کہانی میں نے رات میں نہیں دن میں سنی تھی۔"

دادی جان کو اطمینان ہوگیا، وہ سو گئیں لیکن نوروز جاگتا رہا اور آج وہ برسوں بعد سوچتا ہے کہ اس نے دادی جان سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ کیا وہ آگے کی کہانی سننا نہیں چاہتا تھا؟ مگر کیوں؟ شاید اس لیے کہ گلشن آرا کے لگائے ہوئے باغ کی کہانی وہ سننا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور باغ لگتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اب اجڑتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ باغ ہزاروں سال میں لگ پایا تھا، نوروز کی آنکھیں اس کی گواہ ہیں۔ ہزاروں سال پرانی آنکھیں۔ ایک ایک پودا اس کے سامنے لگا ہے اور ایک ایک پھول اس کی آنکھوں کے آگے کھلا ہے۔ یہ باغ نہیں مختلف پھولوں سے بنی شہزادہ گل ریز کی گیند ہے جو گلشن آرا کے رخ روشن سے ٹکرا کر بکھر گئی ہے۔

نوروز کا دنیا دیکھنے اور زندگی کو سمجھنے کا یہ طلسمی انداز واقعات کو یوں دیکھتا ہے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ شہر میں نٹوں کی ایک ٹولی داخل ہوئی۔ ایک نوجوان نٹ اور اس کی نہایت ملوک نٹنی نے اعلان کیا کہ وہ نقلی پر لگا کر دو کوس تک اڑ سکتے ہیں۔ بس لوگ جمع ہونے لگے۔ اس کی خبر گڑھی کی بالائی منزل پر شہزادی گلشن آرا کے کانوں تک پہنچی۔ شہزادی نے نٹ کے اس جوڑے کو بلوا بھیجا۔ کرتب شروع ہوا۔ مشرقی برج سے چھاج کے نقلی پر لگا کر دونوں اڑے۔ دو

کوس کا دعویٰ تھا، ڈھائی کوس تک اڑتے رہے اور پھر جب گرے تو خدا کا کرنا، دونوں نے وہیں دم توڑ دیا۔ شہزادی گلشن آرا پالکی میں سوار ہو کر جب وہاں پہنچیں تو دیکھتی کیا ہیں کہ وہاں نہ کوئی نٹ ہے اور نہ نٹنی۔ لاش کا کہیں پتا نہ تھا، بس دو پھول کھلے ہوئے تھے۔ رنگ ان کا ایسا کہ دنیا میں مثال نہیں۔ شہزادی گلشن آرا نے حکم نامہ جاری کیا کہ یہاں ایک ایسا باغ لگایا جائے جس میں دنیا بھر کے نایاب و نادر پھول، طرح طرح کے پھل اور بے شمار خوبصورت درخت ہوں۔ باغ کی چہار دیواری ایسی ہو کہ جس میں ہزار دروازے ہوں اور سارے دروازے سبھی کے لیے کھلے رہیں۔ باغ کی پہرے داری گلِ صد برگ کریں اور ان کی سواری گل گوں ہو۔ شہزادی کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ پہلے تمر ہندی، برگد، پیپل اور املتاس کے درخت لگائے گئے اور پھر درمیانی روشیں مولسری، آبنوس اور صنوبر کے درختوں سے آراستہ کی گئیں۔ باغ کے وسط میں ایک عالی شان عمارت تعمیر کی گئی جو باغ کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ لوگ مختلف ممالک سے آتے، اپنے ساتھ نایاب قسم کے پودے لاتے اور باغ کوٹھی میں قیام کر کے محسوس کرتے گویا باغ میں نہیں شہزادی گلشن آرا کے دل میں قیام پذیر ہوں۔ کچھ آنے والے کوہِ قاف کو عبور کر کے آئے تو کچھ سمندر کے راستے۔ دور دور تک اس گل کدے کی شہرت تھی۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اب گلِ داؤدی، گلِ رعنا اور گلِ آفتاب کے ساتھ ساتھ کرمس ٹری، پام کے درخت اور منی پلانٹ کی بیلیں بھی اس چمن زار میں دکھائی دینے لگی تھیں۔

پھر کیا ہوا، کیسے ہوا کہ باغ اجڑنے لگا۔ نوروز بستر پر لیٹا سوچ ہی رہا تھا کہ گلیارے میں ایک شور اٹھا۔ بیٹھک کی کھڑکی کھول کر دیکھا کہ باغ کی پاسبانی کا عزم لیے کچھ لوگ نعرے لگاتے گلی سے گزر رہے ہیں۔ وہ بھی چبوترے پر نکل آیا اور ہجوم کے سنگ سنگ چلنے لگا۔ پھر اس نے جانا کہ بھیڑ باغ میں داخل ہو چکی ہے اور وہ تنہا دروازے کے باہر کھڑا رہ گیا ہے۔ نظریں اٹھائیں تو پایا کہ اب فصیل مزید اونچی کر دی گئی تھی اور اس کے تمام دروازے پتھروں سے چُن دیے گئے تھے۔ صرف صدر دروازہ کھلا تھا، جس پر سیاہ وردی پہنے سپاہی آبنوس کے درختوں کی طرح جامد و ساکت کھڑے تھے۔ اندر جانے کی کوشش کی، پر اسے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ ابھی اجازت نہیں۔ کارروائی شروع ہو چکی ہے۔

دوسرے روز سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ باغ کی طرف روانہ ہوگیا۔ صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ جہاں مولسری اور صنوبر کے شجر تھے وہاں ببول کی کانٹے دار جھاڑیاں اگ آئی ہیں۔ حوض جس میں ہر پل فوارہ چلتا رہتا تھا اسے بارش کے پانی اور کائی کی پرتوں نے مینڈکوں کا مسکن بنا دیا ہے۔ سامنے نگاہ کی تو کھلا کہ باغ کوٹھی کے کھنڈر دم سادھے کھڑے ہیں۔ کوٹھی کی بلند محراب کی طرف گردن اٹھائی تو اندھیرے میں ڈوبے آسمان کا عکس نظر آیا۔ محراب ٹوٹ کر گر چکی تھی اور ستون سرنگوں تھے۔ وہ بڑھتا رہا اور آگے بڑھتا رہا کہ ایک پتھر سے ٹکرا کر اوندھے منہ آگرا۔ کانپتی انگلیوں سے ٹٹولا تو دو قبروں کے نشان پائے۔ اسے معلوم ہے یہ قبریں شہزادہ گل ریز اور شہزادی گلشن آرا کی ہیں۔ اب سورج آسمان پر پاؤں جما چکا تھا۔ صدر دروازے کے باہر ہجوم جمع ہونے لگا۔ نوروز اٹھا اور باغ کوٹھی کے کھنڈر کی ایک دیوار کے پیچھے چلا گیا اور سوچنے لگا۔ نگہداشت کی تمام کوششیں جاری ہیں، پھر آخر یہ باغ روز بہ روز کیوں ویران ہوتا جا رہا ہے؟ باہر ایک ازدحام ہے اور گشت پہلے سے زیادہ سخت۔ ”کیا ہزاروں سال پرانا دیو پھر سے......“

ایک شور اٹھا اور بھیڑ اندر داخل ہوگئی ——— کچھ لوگ حوض کے چبوترے پر، باقی حوض کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ چبوترے پر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ”باغ کی حفاظت کی ذمہ داری اب ہماری ہے۔ صدر دروازے کو بھی باقی دروازوں کی طرح بند کر دینا ہوگا۔“

مجمع سے ایک آواز ابھری ——— ”باہر سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے دامن سمیٹ لیا اور بیٹھ گیا۔

چبوترے پر کھڑا شخص پھر بولا ——— ”یوں تو ہم نے صدیوں سے اس باغ میں کسی گل ریز اور کسی گلشن آرا کو نئی قسم کا کوئی بھی پودا لگانے نہیں دیا ہے، کیوں کہ ہر نیا پودا پرانے پودے کو غارت کر دیتا ہے۔ چہار دیواری کے باہر سے لائے ہوئے پودے لگا کر باغ کی فضا کو آلودہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

نوروز دیوار کی آڑ میں کھڑا حیرت سے سن رہا تھا۔ ”نئے پودوں کی آمد پر بندش؟ کہیں باغ کے ویران ہونے کی یہی وجہ تو نہیں۔ ہاں یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے باغ اجڑا

ہی نہ ہو بلکہ نئے پھولوں کے نہ کھلنے اور نئے پھلوں کے نہ پھلنے کے سبب دنیا کے دوسرے باغوں کے مقابلے میں اجڑتا ہوا سا محسوس ہورہا ہو۔''

اب اس نے دیکھا کہ چبوترے پر کوئی دوسرا شخص آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس شخص نے شلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مسکراتے ہوئے باغ کے چوتھے کھونٹ کی طرف اشارہ کیا، جیسے اس نے رکھوالی کا کوئی کارگر طریقہ ڈھونڈ نکالا ہو۔ دیوار کے پیچھے سے نوروز نے جھانک کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ وہاں سے گلِ رعنا، گل جعفری اور گلِ سوسن کے پودے اکھاڑ دیے گئے تھے۔ ہاں کیتکی اور ناگ پھنی کے پودے قطاروں میں اسی طرح لگے ہوئے تھے۔

''باغ کی صفائی کے نام پر خودرو گھاس سمجھ کر ان لوگوں نے سب پودے اکھاڑ پھینکے۔ گلِ سوسن بھی!'' اس نے چیخ کر کچھ کہنا چاہا مگر اب اس کی زبان پوری طرح گنگ ہو چکی تھی۔ کیوڑے کی جھاڑیوں سے ایک سانپ نکلا اور گلِ شب افروز کے جھنڈ سے ہوتا ہوا بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ کچھ لوگ بلّم بھالے لے کر دوڑے اور سانپ مارنے کے بجائے گلِ شب افروز کے پودوں کو جڑ سے اکھاڑنے لگے۔ اب حوض پر کھڑا وہ شخص کہہ رہا تھا کہ .... ''بے کار اور بے میل پیڑ پودے اکھاڑ پھینکو۔ برگد کی صف میں برگد اور پیپل کی صف میں پیپل۔ پلکھن، چیڑ، ساکھو اور بس ....''

اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ بغیر کچھ سوچے، بغیر کچھ سمجھے بھیڑ چاروں طرف بکھر گئی اور پلک جھپکتے خیار شنبر، پام اور اریوکیریا کے درخت بھی اُکھاڑ پھینکے۔

''اے خدا یہ باغ کی زیبائش کا کون سا طریقہ ہے؟ اے میرے پاک پروردگار کیا اب اسے بچانے کی کوئی تدبیر نہیں۔ اے قادرِ مطلق کوئی ترکیب بتا۔ ہاتھ میں چاقو اور سرخ مرچوں کی شیشی لے کر کسی شہزادے کو بھیج۔'' اتنے میں دیکھتا کیا ہے کہ کچھ نوجوان ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے ہاتھ میں شیشی لیے باغ میں داخل ہوئے۔ وہ سب پہرے کے لیے باغ کے کونے کونے میں منتشر ہونا ہی چاہتے تھے کہ ایک بوڑھا شخص سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو میرے چہرے پر یہ جھریاں دیکھو۔'' پھر اس نے کٹی انگلی کا زخم دکھایا اور رقت آمیز لہجے میں بولا۔'' میں یہ ترکیب صدیوں سے آزماتا آرہا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تدبیر اب کارگر نہیں رہی۔ اب کوئی دیو باغ کی دیوار پھلانگ کر اسے اجاڑنے کے لیے باہر

سے نہیں آتا، اس کے اجڑنے کا سبب کچھ اور ہے، تو ظاہر ہے نگہبانی کی تدبیر بھی کچھ اور ہی ہوگی۔" اتنا سننا تھا کہ مجمع پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور پھر ایک ایک کر کے سب واپس ہو لیے۔ وہ بھی جو بعد میں آئے تھے اور وہ بھی جو حوض کے گرد جمع تھے۔

ایک روز پھر شہر میں ڈگی پٹی، اعلان ہوا کہ: "باغ کی حفاظت کے تمام حربے آزمائے جا چکے ہیں، مگر ہر بار ناکامی ہاتھ آتی ہے۔ باغ متواتر ویران ہوتا جا رہا ہے۔ ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سورج طلوع ہونے سے قبل باغ کے صدر دروازے پر پہنچے۔" سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ صدر دروازہ بند تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ نوروز بھی ہزاروں سال پرانی آنکھوں میں ویرانی لیے وہاں موجود تھا۔ دروازے پر بڑی سینی میں چاندی کے ورق میں لپٹا ایک بیڑا رکھا تھا۔ ایک جم غفیر تھا مگر خاموش.............. "تو کیا اسی طرح لوگ شام ہوتے ہوتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے؟" آخر کار شام بھی ہو گئی۔ دن بھر کی گرم ہوا نے سینی میں رکھے بیڑے کو جھلسا دیا۔ لگتا تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لوگ پلٹیں گے اور واپس شہر کی طرف دوڑ پڑیں گے کہ اچانک مجمع سے ایک آواز آئی جیسے بجلی چمکی ہو اور پھر بادل گرجنے لگے۔ مجمع کو چیرتا ایک بوڑھا، اپنی جھولی کو بغل میں دبائے صدر دروازے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ نوروز نے پہچاننے کی کوشش کی۔ "کیا یہ گل ریز ہے؟ نہیں۔ تو پھر شاید نوروز۔ نہیں۔ میں تو یہاں کھڑا ہوں اگر اس وقت میرے چہرے کے سامنے آئینہ ہوتا تو ضرور اس بوڑھے کو قریب سے دیکھ پاتا۔" اس نے تھوڑا آگے بڑھ کر پہچاننے کی کوشش کی۔ "ارے یہ تو وہی بوڑھا ہے جس نے کٹی انگلی کا زخم دکھا کر مجمع کو واپس کیا تھا۔ اس دن یہ کتنا مایوس تھا مگر آج اس کے چہرے پر یہ چمک؟ شاید میری آنکھوں کی چمک ہو۔" پھر کیا تھا، بوڑھے نے بیڑا اٹھایا اور آسمان کی طرف دیکھ کر منہ میں رکھ لیا۔ لوگ مضطرب تھے، شاید دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کی جھولی میں کیا ہے؟ بوڑھے کی تجربے کار آنکھیں مسکرائیں۔ اس نے جھولی میں ہاتھ ڈالا، سب سے پہلے جو چیز نکلی وہ گلِ ہزارہ کی ایک خوبصورت گیند تھی۔ پھول کی اس گیند کے چاروں طرف نیلوفر، نسترن اور یاسمین کی پتیاں گندھی ہوئی تھیں۔ اس جھولی سے پھر ایک تیشہ نکلا۔ نوروز نے دیکھا کہ تیشے کی نوک پر فصیل کے تمام بند دروازوں کو توڑنے کا عزم چمک رہا تھا۔

''سب سے پہلے باغ کے تمام دروازے کھولنے ہوں گے۔'' بوڑھے نے کہا۔
نوروز کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ باغبانی کے اوزار اور کچھ نایاب و نادر پھولوں کے پودے دیکھ کر وہ بوڑھے کے بالکل قریب جا پہنچا، اتنا قریب کہ شاید دونوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا۔

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ایک آواز آئی۔

''رکھوالی کا یہ کون سا طریقہ ہے؟''

بوڑھے نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور نرمی سے کہا۔ ''آپ سے دست بستہ گزارش ہے کہ سب اپنی اپنی مُٹھیاں کھول دیں۔''

سب نے بند مُٹھیاں کھول دیں، پھر صدر دروازہ کھلا، بوڑھا باغ میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ ٹھٹھکا، پلٹ کر نوروز کی طرف آیا اور بولا۔ ''ممکن ہے میں باغ کی نگہبانی میں کامیاب ہو جاؤں۔ ممکن ہے باغ پھر سے سرسبز ہو جائے۔ ممکن ہے اس گلستان کا دامن بہت وسیع ہو جائے مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ باغ پھر نہیں اُجڑے گا۔'' نوروز یہ سوال سن کر بوڑھے کے قدموں میں گر گیا۔ بوڑھے نے جھک کر اسے اٹھایا اور جھولی میں ہاتھ ڈال دیا۔ سب تعجب سے دیکھ رہے تھے کہ اب جھولی سے کیا نکلتا ہے۔ اس نے جھولی سے سیاہ دستے اور تیز دھار والی کوئی شے نکال کر نوروز کے ہاتھ میں تھما دی۔

''شاید چاقو ہے! لیکن مرچوں کی شیشی؟'' نوروز سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے نے پھر جھولی میں ہاتھ ڈال دیا اور ایک شیشی نکال کر نوروز کو دی اور کہا۔ ''اگر تو اس کا صحیح استعمال کرے گا تو یہ باغ قیامت تک شاداب و سرسبز رہے گا، لیکن ....''
اس نے 'لیکن' سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر پھر 'لیکن' کے سوا کچھ نہ کہہ سکا اور مجمع کی طرف دیکھ کر مایوس ہو گیا۔

نوروز نے دونوں چیزوں کو دیکھا۔ ان میں نہ کوئی چاقو تھا اور نہ مرچوں کی شیشی۔
اس نے پھر غور سے دیکھا اور سیاہ مگر روشن رقیق سے لبریز شیشی کے ڈھکن کو کھولا اور تیز دھار والی چیز کے ایک سرے کو داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور دو انگلیوں کے پوروں کے درمیان دبا کر شیشی میں ڈبو دیا۔ ایسا کرتے ہی اس کے چہرے سے دانش وری کی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور باغ کی فصیل پر ایک تحریر ابھر آئی۔ نوروز کے ذہن کے تار جھنجھنانے لگے۔ آسمان کی جانب

نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ ایک پریوں کی شہزادی، ماتھے پر نقرئی تاج، ہاتھ میں قدیم ساز، ہنس پر سوار، باغ کے دروازے کے بہت قریب سے گزر رہی ہے۔

یہ ماجرا نوروز اور بوڑھے کے سوا سب کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا اور پھر یوں ہوا کہ جس نے بوڑھے کو دیکھا وہ نوروز کو نہیں دیکھ سکا اور جو نوروز کو دیکھ رہا تھا اس کی نظروں سے بوڑھا غائب تھا۔

○○○

گلوب

وہ آسمانی رنگ کی مہین نائٹی پہنے کھڑکی کے پاس ڈبل بیڈ پر نیم دراز تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی کے بلب اونگھ رہے تھے۔ راجو گھر کے کام سے فارغ ہو کر کمرے میں داخل ہوا، کھڑکی کے پردے ٹھیک کیے اور فریج سے رائل چیلنج کی بوتل نکال کر اسٹول پر رکھ دی۔ آئس کیوب، پانی اور ایک گلاس۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

''میم صاحب۔''

''ایڈیٹ، ادھر آ۔''

اور اس نے راجو کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے اوپر کھینچ لیا۔ راجو کے اوپری ہونٹ پر پسینے کے قطرے جمنے لگے۔

اب اس کا معصوم چہرہ جوان عورت کے ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔ عورت کی انگلیاں گل کر بہہ چکی تھیں۔ راجو کو اپنے گالوں پر پیپ رسنے کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ بہت سے کینچوئے ناک کان اور منہ میں رینگ رہے ہیں۔ اسے جھرجھری آئی لیکن جیسے ہی نظر عورت

کے سینے پر پڑی سانسیں تھمنے لگیں اور انگلیاں کلبلا اٹھیں۔ عورت نے گہری سانس لی، سینے کا ابھار بڑھا اور راجو کی نظروں کے سامنے برف سے ڈھکی ایک چٹان آ گئی۔

اس کے پاؤں برف میں دھنسے ہوئے تھے اور وہ پہاڑی کے اس طرف والے مندر کے پجاری کا سامان لادے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بازار سے مندر کی دوری کئی کوس تھی۔ ہر ہفتے کھانے پینے کا سامان راجو ہی لے کر آتا۔ مندر پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی اور پجاری کمبل میں سمٹا ٹھنڈ سے کپکپا رہا تھا۔ راجو نے سامان رکھا اور لالٹین کی لو تیز کی، مندر کی شکستہ دیواریں صاف نظر آنے لگیں۔ پجاری نے چیخ کر کہا۔

''لالٹین بجھا دے اور ادھر آ ——''

اس کا ہاتھ پکڑ کر پجاری نے اسے کمبل میں کھینچ لیا تھا۔

برف سے ڈھکی چٹان ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑی تھی اور برف کے ریزے اڑ کر راجو کے منہ پر آ جمے تھے جو اب پگھل کر پسینے کے قطروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

عورت نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے کمر سے دبوچ لیا اور پہلے اس کے چہرے کی طرف اور پھر اپنے ننگے شانوں کی طرف نظروں سے اشارہ کرکے کہا۔

''پسینا پونچھ اور یہاں ہاتھ رکھ ——''

شانے تھرک رہے تھے اور ننگی بانہیں راجو کی گردن میں جھول رہی تھیں۔ جی چاہا کہ بغل کے پاس کی ملائم کھال کو چوم لے مگر حکم تو شانوں پر ہاتھ رکھنے کا تھا۔ وہی شانے جنہیں چوری چھپے وہ اکثر دیکھا کرتا، ان کو چھو لینے کی خواہش رہ رہ کر دل میں اٹھتی، لیکن اس وقت ہاتھ کسی دوسرے حکم کی تعمیل میں مصروف ہوتے، اور آج حکم ہے شانوں کو چھونے کا تو نہ جانے کیوں ہاتھ بغل کے پاس کی ملائم کھال تک پہنچ کر رک جاتے ہیں۔

''راجو —— '' عورت نے تیز لہجے میں کہا۔

اس نے گھبرا کر دونوں شانوں کو پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھوں میں دو خارش زدہ پلّے کلبلا رہے تھے۔

'آج وہ ان پلّوں کا گلا گھونٹ دے گا ——'

اس نے گرفت مضبوط کی لیکن خارش زدہ پلے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر بستر پر آن کودے۔ دراصل عورت نے اسٹول سے شراب کا گلاس اٹھانے کے لیے کروٹ لی تھی۔ گلاس

میں بھری شراب اور انگلیوں پر لگی نیل پالش کا رنگ ایک تھا۔

'اس کی انگلیاں کتنی خوبصورت ہیں ——'

پیپ بہتی انگلیوں کی جگہ نیل پالش لگی انگلیاں اس کے سامنے تھیں، خارش زدہ پلے کہیں غائب ہو گئے تھے اور خوبصورت شانے تھرک رہے تھے۔ اس نے بڑھ کر انہیں پکڑنا چاہا مگر عورت نے پھر کروٹ لی اور اس کے ہاتھ بستر کی ٹھنڈی چادر پر جا ٹکے۔ شراب جوان عورت کی آنکھوں میں اتر آئی تھی اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔

دہکتے انگاروں کی گرمی سے راجو کا بدن جھلس رہا ہے۔ سامنے دو بڑی بڑی بھٹیاں دہک رہی ہیں، جن میں دن بھر اسے کوئلے ڈالتے رہنا ہے۔ کارخانے کے مالک کا حکم ہے۔ انگارے پوری آب و تاب کے ساتھ دہکتے ہیں اور پھر راکھ ہو جاتے ہیں۔ وہ بھٹی میں نئے کوئلے ڈالتا ہے۔ کوئلوں میں چنگاریاں اٹھتی ہیں، پھر آگ جوان ہو جاتی ہے اور بالآخر راکھ۔ لیکن بھٹی دہکتی رہتی ہے۔ اس میں پھر نئے کوئلے ڈال دیے جاتے ہیں......... اور یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔

پسینے کے قطرے اس کے پورے جسم میں سانپوں کی طرح رینگ رہے ہیں اور انگاروں کی تپش سے اس کا چہرہ جھلستا جا رہا ہے۔

دو سرخ انگارے اس کی آنکھوں کے بہت قریب دہک رہے تھے کہ ان پر شبنم کے قطرے جمتے محسوس ہوئے۔ شراب کا گلاس خالی ہو چکا تھا اور آنکھیں لبریز تھیں۔ خوبصورت آنکھیں۔ اس نے آنکھوں پر جھکنے کی کوشش کی۔

''وقت برباد مت کر ——'' عورت نے کہا۔

دھپ سے اس کی گردن پر کارخانے کے مالک نے ہاتھ مارا۔

''دیکھتا نہیں آگ بجھتی جا رہی ہے۔''

وہ سہم گیا اور تھوڑی دیر میں ہانپتے ہانپتے پلنگ سے نیچے لڑھک پڑا۔ کچھ دیر قالین پر اکڑوں بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک روز جب آسمان میں بادل منڈلا رہے تھے اور پرندوں کے جوڑے پر پھلائے شاخوں پر بیٹھے ایک دوسرے کو چونچیں مار رہے تھے تو اس کے جسم کی بوٹی بوٹی پھڑک اٹھی تھی۔ اس نے دیکھا کہ شاخ پر بیٹھے ایک پرندے نے پر پھڑپھڑائے، اُڑا، فضا میں

دو چار چکر کاٹے اور ایک دوسری شاخ پر جا بیٹھا۔ اسی طرح دوسرا پرندہ پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ وہ اٹھا، تیز تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوا، فریج کھولا، بوتل نکالی، شراب حلق میں انڈیلی اور لڑکھڑاتا ہوا سامنے میز پر رکھے گلوب سے جا ٹکرایا۔ گلوب گھومنے لگا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے پہاڑ، دریا، سمندر اور ریگستان تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ ڈگمگاتے قدموں سے باہر میدان میں آ گیا۔

میم صاحب کے لوٹنے میں ابھی دیر تھی۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا سامنے ایک وسیع میدان ہے جس کا ایک سرا آسمان سے جا ملتا ہے۔ محسوس ہوا کہ زمین کے کچھ حصوں میں جنبش ہو رہی ہے اور پھر ایک ہی پل میں کہیں پہاڑ ابھر آئے تو کہیں گہری کھائیاں بن گئیں۔

گلوب اب بھی گھوم رہا تھا۔

پہاڑ، دریا، سمندر اور ریگستان سبھی گھوم رہے تھے۔ ایک ہیولے کی طرح۔ کہ اچانک گھومتے گلوب پر ایک سایہ ابھرا اور اس نے پوری کائنات کو ڈھک لیا۔ سائے کے خد و خال واضح ہوئے تو اس نے دیکھا کہ سامنے ایک عورت لیٹی ہے۔ اسے لگا کہ پوری کائنات اس عورت میں سمٹ آئی ہے۔ قدم بڑھا کر اس کے سینے پر رکھنا چاہا لیکن معلوم نہیں کیسے پاؤں کھائی میں جا پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا، سنبھلا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ اس میں حوصلہ تھا، ایک ہی ڈگ سے پوری دنیا کو ناپنے کا حوصلہ۔ لیکن جانے کیوں قدم اس کی مرضی کے خلاف پڑ رہے تھے۔ جب اس نے اپنے پاؤں پاٹھ شالا کی دہلیز پر رکھے تبھی اس کے پتا چل بسے اور وہ پجاری کے کمرے کی شکستہ دیواروں سے جا ٹکرایا۔ رگوں کے سرد خون میں حرارت پیدا کرنے کی کوشش کی تو کارخانے کی بھٹی نے اس کے پورے وجود کو جھلسا دیا اور اب پاؤں رکھنا چاہتا ہے عورت کے سینے پر تو جا گرتا ہے کسی انجان گہری کھائی میں۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ بادل غبار کی مانند فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔

'میم صاحب کو آئے ہوئے دیر ہو گئی ہو گی۔ غصے میں بھری گلاس پر گلاس چڑھا رہی ہوں گی۔'

وہ ڈگمگاتے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ میم صاحب آج پھر آسمانی رنگ کی

مہین نائی پہنے کھڑکی کے پاس بچھے ڈبل بیڈ پر نیم دراز ہیں۔ آنکھیں سرخ ہیں، ہونٹ کانپ رہے ہیں اور کچھ کہے بغیر اسے گھورے جا رہی ہیں۔ راجو آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر کھڑکی تک پہنچتا ہے۔ کھڑکی کے پردے ٹھیک ہی کر رہا ہوتا ہے کہ میم صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے اوپر کھینچ لیتی ہیں۔ اس کا منہ تکیے پر بچھی زلفوں میں جا گڑتا ہے۔ جسم پر ملی بھبوت اور کھچڑی داڑھی کے گندے بالوں کی بو، اس کے جسم میں تیر جاتی ہے۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ہٹ جاتا ہے۔ عورت کی سیاہ اور خوشبودار زلفیں بستر پر بکھری پڑی تھیں۔ اب وہ دیکھتا ہے کہ مہین نائی کے اندر پھڑ پھڑاہٹ ہو رہی ہے۔ یک بیک پرندے باہر نکل آتے ہیں، اس کی آنکھوں میں چونچیں مارتے ہیں اور کھلی فضا میں چکر کاٹ کر ایک شاخ پر جا بیٹھتے ہیں۔ وہ کسی انتظار کے بغیر ہاتھ بڑھا کر ایک ہی لمحے میں پرندوں کو اپنی مٹھی میں دبوچ لیتا ہے۔

''باسٹرڈ.........'' میم صاحب اسے زور سے جھڑک دیتی ہیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے گالوں پر رکھ لیتی ہیں۔

''یہاں ——''

اس کے ہاتھوں میں جمے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، انگلیاں کانپنے لگتی ہیں اور وہ میم صاحب کے چہرے کو دوسری جانب ڈھکیل کر تھرکتے شانوں کو پکڑ لیتا ہے۔ میم صاحب حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ کسی حکم کا انتظار کیے بغیر عورت کی گردن پر اپنے ہونٹ گڑا دیتا ہے اور جنون کے عالم میں جسم کے ہر حصے کو چومنے لگتا ہے۔ ان گنت تیر عورت کے جسم میں چبھ جاتے ہیں۔ وہ تڑپنے لگتی ہے، کسمساتی ہے، اس کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتی ہے لیکن آج راجو کے جسم میں بلا کی طاقت آ گئی ہے۔ وہ مڑتا ہے اور کارخانے کے مالک کو اٹھا کر دہکتی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ عورت کی دونوں ٹانگیں اپنی باہوں میں جکڑ کر اتنا زور لگاتا ہے کہ مندر کے کھمبے ہلنے لگتے ہیں اور پھر مندر کی عمارت ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ملبے کے نیچے سے پجاری کی بھنچی بھنچی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔

''کمینے.........نمک حرام، تیری یہ ہمت!'' 'چٹاخ' عورت کا ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر۔ اس کا سر چکرانے لگا، آنکھوں میں اندھیرا امنڈ آیا جیسے پجاری نے لالٹین بجھا کر اسے اپنے کمبل میں کھینچ لیا ہو۔

''تیری یہ مجال .... اپنی مرضی کا مالک بنتا ہے نمک حرام ....''

طوفان کی طرح میم صاحب اٹھتی ہیں اور اسے لاتوں سے مار مار کر فرش پر لڑھکاتے لڑھکاتے اس دروازے تک لے آتی ہیں جس کے برابر لگی کھڑکی کے بند شیشوں سے باہر کی فضا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دیکھا، باہر ہوا خاموش ہے، بادل چھٹ چکے ہیں، چاند سفیدی کے قطرے ٹپکا رہا ہے اور پرندے شاخوں پر بیٹھے بیٹھے سو گئے ہیں۔

وہ دروازے کی طرف مڑا اور چٹخنی کھولنے کے لیے اٹھنے کی کوشش کی تو عورت نے اس کے پیٹ میں کس کر ایک اور لات جما دی۔

''جاتا کہاں ہے؟ ادھر آ ....''

اس نے ڈری سہمی نظروں سے عورت کی جانب دیکھا مگر اس کی نظروں کے سامنے عورت کے بجائے ایک بڑا گلوب تھا، جو تیزی سے گھوم رہا تھا ——— !

○○○

نیم پلیٹ

''کیا نام تھا اس کا؟ اُف بالکل یاد نہیں آرہا ہے۔'' کیدار ناتھ نے اپنے اوپر سے لحاف ہٹا کر پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''یہ کیا ہوگیا ہے مجھے، ساری رات بیت گئی نیند ہی نہیں آرہی ہے۔ ہوگا کچھ نام وام نہیں یاد آتا تو کیا کروں، لیکن نام تو یاد آنا ہی چاہیے۔ آخر وہ میری بیوی تھی، میری دھرم پتنی۔'' انہوں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پچھتر سالہ کیدار ناتھ کے ماتھے کی بے شمار جھریاں بوڑھی ہتھیلی کے نیچے دب کر پھڑ پھڑانے لگیں۔

''سرلا کی ماں ....'' ان کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر کچھ نام بھی تو تھا اس کا۔ کیا نام تھا؟ اس کے نام کا پہلا اچھر ہاں کچھ کچھ یاد آرہا ہے..........'' انہوں نے پیر پلنگ کے نیچے لٹکا دیے اور وہ لائٹ آن کرنے کے لیے دیوار میں لگے سوئچ کی طرف بڑھے۔

''اس کے نام کا پہلا اچھر .... ''کے'' نہیں نہیں۔ ہاں ہاں یاد آ گیا۔''
ان کا جھریوں سے بھرا پوپلا منہ مسکرانے کے لیے تیار ہو ہی رہا تھا کہ کھانسی کا ایک ٹھسکا لگا اور پھر بھول گئے کہ وہ اچھر کیا تھا۔
کمرے میں چاروں طرف روشنی پھیل چکی تھی۔
''ڈھائی بجنے کو ہیں۔'' ان کی نظر ٹائم پیس پر پڑ گئی۔
''ٹائم پیس ....؟ ہاں .... ٹا .... نہیں، پیس ....'' سا''

ارے ہاں ——

''سا'' ہی تو تھا اس کے نام کا پہلا اچھر۔''
''سا''؟ نہیں یہ تو سرلا کی ماں ....
''پھر سرلا کی ماں۔ آخر نام بھی تو کچھ تھا اس کا۔'' کیدار ناتھ نے جھنجھلا کر سرہانے رکھی چھڑی کو اٹھایا، گلے میں کس کے مفلر لپیٹا اور بار بار چھڑی کو فرش پر پٹخنے لگے۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چھڑی کو جکڑ کر اس طرح سر کے قریب لائے جیسے اس کے ہتھے سے اپنا سر پھوڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔
''تعجب ہے اپنی بیوی کا نام بھول گیا! اسے مرے ہوئے بھی تو چالیس برس گزر گئے ہیں۔ تین سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ صرف تین سال ہی تو اس کے ساتھ رہ پایا تھا میں۔''

وہ خالی خالی نظروں سے کمرے کو گھور رہے ہیں۔ پلنگ، میز، کرسی اور الماری' کتابیں .... الماری کتابوں سے بھری پڑی ہوگی، الماری کے پٹ بند ہیں۔ وہ پلنگ کی جانب بڑھے اور پھر الماری کی طرف مڑ گئے۔ دروازہ کھولا الماری خالی تھی —— نہ اس میں کتابیں تھیں اور نہ خانے۔ ''ارے اس میں تو پچھلی دیوار بھی نہیں ہے۔''
وہ لرز گئے اور گھبرا کر ایک پاؤں اس کے اندر رکھ دیا پھر دوسرا پاؤں' اب وہ دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ سب کچھ خالی تھا، ان کے ذہن کی طرح، وہ سمت بھول گئے تھے اور الماری کے بجائے باہر جانے والا دروازہ کھول بیٹھے تھے۔ باہر سڑک پر کہرا جما ہوا تھا۔ کھمبوں کے بلب مدھم دیوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ سنسان سڑک پر انہیں لگا کہ یکا یک بھیڑ امنڈ آئی ہے۔ چاروں طرف شور ہو رہا ہے۔ باجے کے شور سے کان پھٹے جا رہے ہیں۔۔

دور کہرے میں چھپی ہوئی ڈولی ـــــ سرخ جوڑا پہنے دلہن مسکرا رہی ہے۔

سڑک پر ایک پتھر کا ٹکڑا پڑا تھا، انہیں ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر کھمبے سے جا ٹکرائے، بہت زور سے دھکا دیا تھا محلے بھر کی لڑکیوں نے 'اور پھر دروازہ بند۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' نام معلوم ہوتے ہوئے بھی اس کا نام پوچھا تھا انہوں نے۔ وہ شرما گئی تھی اور گھٹنوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ انہوں نے پھر پوچھا تو اس نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

''کیا بتایا تھا اس نے؟ اُف بالکل یاد نہیں۔'' اور وہ چھڑی کو زمین پر ٹیکتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔ انہیں کہاں جانا ہے؟ پتہ نہیں۔ پھر بھی وہ چلتے رہے اور اب اپنے گھر سے بہت دور نکل آئے تھے۔

یہ علاقہ کون سا ہے؟ کیلاش نگر؟ ہاں شاید وہی ہے۔ آگے دائیں طرف ان کے دوست شرما جی کی کوٹھی ہے۔ باہر گیٹ پر نیم پلیٹ لگی ہے۔ ''ست پرکاش شرما'' وہ ان کے دفتر کے ساتھی تھے۔ گزرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔

اچانک کیدار ناتھ ٹھٹکے اور رک گئے۔ ''ارے یہی تو ہے شرما جی کی کوٹھی، ہاں بالکل یہی ہے۔ وہاں لگی ہے ان کے نام کی پلیٹ۔'' کیدار ناتھ کو کہرے کی دھندلی فضا میں ایک تختی نظر آئی۔

''شرما.........'' انہوں نے پڑھا۔ ''رام پرکاش شرما۔''

''رام پرکاش.........؟ نہیں ان کا نام تو ست پرکاش تھا۔ پھر غور سے دیکھا۔

''رام پرکاش شرما (ایڈوکیٹ)۔'' صاف صاف لکھا تھا۔

انہیں یاد آیا کہ ایک روز شرما جی نے کہا تھا۔ ''میرا بیٹا رام پرکاش ایڈوکیٹ ہو گیا ہے۔''

''اچھا تو اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اکھاڑ کر.........'' کھٹ سے کوئی چیز گری۔ انہیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز نکل کر قدموں میں آن گری ہے۔ وہ سہم گئے اور مجرم کی طرح گردن جھکا لی۔ یہ کسی کے نام کی پلیٹ تھی۔ مگر ایک حرف بھی صاف نہیں۔ سب کچھ مٹ چکا ہے۔ ان کے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ لاغر ٹانگیں جو ابھی کانپ رہی

تھیں، پیاسے ہرن کی طرح کلانچیں مارنے کو بیتاب ہو اٹھیں۔

وہ بھاگ رہے ہیں۔ نہیں آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ یا رینگ رہے ہیں یا پھر کھڑے کھڑے ہی.......... یہ تو معلوم نہیں مگر اب وہ اپنے گھر سے کئی میل دور سرلا کے گھر کے بہت قریب آن پہنچے ہیں۔

سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھ ہی لیں گے۔

سرلا کو اپنی ماں کا نام یاد ہوگا؟ کیوں نہیں...... کوئی ماں کا نام بھی بھولتا ہے کیا۔

''پاروتی دیوی......'' ان کی ماں کا نام پاروتی دیوی تھا۔ انہیں پچھتر سال کی عمر میں بھی اپنی ماں کا نام یاد ہے۔

''پاروتی دیوی کی جے..........'' بچپن میں وہ اپنے بابا کے ساتھ بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ ''بابا.......... اماں کا نام بھی تو پاروتی دیوی ہے۔'' ''ہاں بیٹے یہی پاروتی دیوی ہیں جن کے نام پر تمہاری اماں کا نام رکھا گیا ہے۔'' اور اس روز سے وہ آج تک روزانہ پاروتی دیوی کی پوجا کرتے ہیں اور جے بولتے ہیں۔ ماں تو بھگوان کا روپ ہوتی ہے، پھر بھلا سرلا کیسے اپنی ماں کا نام بھولی ہوگی۔ کیدارناتھ کا دل اندر سے اتنا خوش ہو رہا تھا کہ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ رفتار میں دھیما پن آ گیا مگر وہ اپنے بوڑھے جسم کو ڈھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے ——!!

''بابو جی آج اتنے سویرے آپ ادھر..........؟'' سرلا نے کسی سوچ میں ڈوبے کیدارناتھ کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے پوچھا۔ بوڑھے آسمان کی گود سے نئے سورج کا گولا جھانک رہا ہے۔ کیدارناتھ کے پنجوں کی انگلیاں سرد ہو کر سُن پڑ چکی ہیں، جیسے ان میں گوشت ہے ہی نہیں اور وہ اندر سے بالکل خالی، بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں، پرندے ان کے سر پر منڈلاتے سرلا کے مکان کے اوپر جا بیٹھتے ہیں اور وہ سرلا کے مکان کے باہر کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں۔ ''میں یہاں کھڑا ہوں۔ آتے جاتے لوگ دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ اب تو دن چڑھے کافی دیر ہوگئی ہے۔ سرلا سو کر اٹھ گئی ہوگی۔ اندر چلنا چاہیے۔ لیکن کیا واقعی سرلا نے اب تک اپنی ماں کا نام یاد رکھا ہوگا؟ شرما جی کے بیٹے نے اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اکھاڑ کر......'' ''چھت سے کوئی چیز گری، انہیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز نکل کر قدموں میں آن گری ہے۔ دھندلے دھندلے حروف ابھرنے لگے اور ان کی آنکھوں میں اندھیرا

چھا گیا۔ اندھیری رات .... کُہرے سے بھری ہوئی سرد رات .... بے شمار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، کئی آوارہ کتے ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ کتوں سے بچنے کے لیے ملٹن پارک میں گھس جاتے ہیں۔ ملٹن پارک؟ اب تو اس کا نام گاندھی پارک ہوگیا ہے۔ گاندھی پارک ہو یا ملٹن پارک، ہے تو یہ وہی پارک جہاں وہ شادی کے دو دن بعد اسے لے کر آئے تھے۔ پارک کی بارہ دری ٹوٹ کر کھنڈر بن گئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی بارہ دری کے پتھروں کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں چالیس برس پرانی بارہ دری میں گھس جاتی ہیں۔ ''آؤ یہاں بیٹھو .... کتنی خوبصورت ہیں یہ محرابیں۔'' وہ دونوں سنگ مرمر کے ستون سے کمر ٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر وہ دنیا سے بے خبر بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ مہینوں .... برسوں .... کہ اچانک ان کی بیٹی سرلا نے انہیں چونکا دیا۔

''بابو جی آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں بیٹی۔ میں سوچ رہا تھا آج اتنے سویرے .... اصل میں، میں نے سوچا جوگیندر کے دفتر جانے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں تو اچھا ہے۔''

''بابو جی آج تو اتوار ہے۔''

''اوہ، ہاں آج تو اتوار ہے۔ کیا کروں بیٹی ریٹائر ہونے کے بعد دن تاریخ یاد ہی نہیں رہتے۔''

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے۔ ''دن تاریخ کیا اب تو بہت کچھ یاد نہیں رہا۔''

اتنے میں جوگیندر بھی آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور کیدار ناتھ کو پرنام کر کے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''بابو جی اتنے سویرے؟ سب ٹھیک ہے نا۔''

''میرے جلدی آنے پر یہ لوگ اتنا زور کیوں دے رہے ہیں۔ ضرور میرے اچانک آنے سے یہ سب ڈسٹرب ہوئے ہوں گے۔ مجھے چلے جانا چاہیے، ابھی ....''

کیدار ناتھ کو خاموش بیٹھا دیکھ کر سرلا بول پڑی۔ ''ارے بابو جی تو بھول ہی گئے تھے کہ آج اتوار ہے اسی لیے تو اتنی جلدی ....''

''آج اتوار ہے اور میں اس طرح بغیر بتائے یہاں چلا آیا ہوں۔ ہوسکتا ہے ان دونوں کا کوئی پروگرام ہو۔ اب میری وجہ سے ....''

’’ہفتے میں چھٹی کا ایک ہی دن تو ملتا ہے ان لوگوں کو۔ مگر میں بھی تو روز روز نہیں آتا، گھر سے چل پڑا تھا، بس چلتا رہا اور چلتے چلتے جب سرلا کے گھر کے قریب آ گیا تو سوچا، ملتا چلوں، کیا یہ لوگ آج میرے لیے اپنے پروگرام نہیں چھوڑ سکتے؟‘‘

کیدارناتھ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ہیں۔

’’کمبخت بڑھاپے میں آنسو بھی کتنی جلدی نکل آتے ہیں۔‘‘ وہ آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے کہ سرلا نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ ’’یہ اس طرح کیا دیکھ رہی ہے؟ کہیں سب کچھ سمجھ تو نہیں گئی۔‘‘

’’کیا سمجھے گی؟ یہ کہ میں اپنی بیوی کا نام بھول گیا ہوں اور رات بھر جاگتا رہا ہوں یا یہ کہ میں رو رہا ہوں۔‘‘

’’بیٹی آج مجھے جوگیندر سے کچھ کام تھا........‘‘

’’بابو جی مجھ سے؟‘‘ جوگیندر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

’’ہاں یوں ہی، کوئی خاص بات نہیں تھی —— ‘‘ پھر وہ لان کی طرف جھانکنے لگے۔

’’آج بہت سردی ہے۔ تمہارے لان میں تو سویرے ہی دھوپ آ جاتی ہے۔‘‘ سرلا نے لان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

’’ہاں بابو جی، ابھی تو دھوپ میں تیزی بھی نہیں آئی اور اوس بھی بہت ہے، پورا لان گیلا........‘‘

وہ کہہ رہی تھی کہ جوگیندر بیچ میں بول پڑے۔

’’بابو جی ابھی کچھ کام کے سلسلے میں آپ کہہ رہے تھے..........‘‘

’’کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں جلدی سے کام بتا کر چلتا بنوں تاکہ ان کے پروگرام ڈسٹرب نہ ہوں۔‘‘ کیدارناتھ کھانسنے لگے اور کافی دیر تک کھانستے رہے۔ وہ کھانس رہے تھے اور سوچتے جا رہے تھے کہ اب کیا کہوں کہ بغیر سوچے سمجھے ہی بول پڑے ——

’’بیٹے تمہیں نام یاد رہتے ہیں؟‘‘

’’کیسے نام بابو جی؟ ویسے میں ہمیشہ نام یاد رکھنے میں کمزور رہا ہوں، اسی

لیے ہسٹری کے پرچے میں میرے نمبر بہت کم آتے تھے۔''

''اب کیا پوچھوں؟ کیا سرلا سے یہی سوال کروں؟ مگر یہ تو بڑی بے تکی بات ہوگی۔ اگر سرلا خود ہی بول پڑے کہ بابو جی مجھے نام یاد رہتے ہیں، تو جلدی سے پوچھ لوں کہ بتاؤ تمہاری ماں کا نام کیا تھا ـــــ''

کیدارناتھ نے حسرت بھری نظروں سے سرلا کی طرف دیکھا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر کچن کی طرف چل دی ـــــ

سورج چڑھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ دھوپ میں بھی تیزی آتی جارہی تھی۔ لان کی ہری گھاس پر جمے شبنم کے قطرے اپنا وجود کھو چکے تھے۔ کیدارناتھ نے اپنے جسم پر چڑھے گرم کپڑوں کو اس طرح ٹٹولا جیسے وہ ڈھونڈ رہے ہوں کہ کپڑوں کے اندر جسم ہے بھی یا نہیں۔

دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ لیکن ابھی تک سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھنے کا موقع نہیں مل پایا تھا۔ سرلا صبح سے کھانا تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ کیدارناتھ باہر دھوپ میں جا کر بیٹھتے تو کبھی اندر آ کر برآمدے میں ٹہلنے لگتے۔ کبھی جوگیندر سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور کبھی سرلا آتی تو اس موقع کی تلاش میں رہتے کہ ذرا جوگیندر اٹھ کر جائیں اور وہ اکیلے میں سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھ لیں۔

''اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ کھانے پر بات میں بات نکلے گی، تب تو پوچھ ہی لوں گا۔'' انہوں نے سوچا اور مطمئن ہو گئے۔

کھانے کی میز سج چکی ہے۔ سرلا نے کئی طرح کی سبزیاں بنائی ہیں ـــــ کھانا بہت لذیذ ہے۔ آج بہت دنوں بعد اپنی بیٹی کے ہاتھ کا کھانا ملا ہے۔ نوکر کے ہاتھ کا کھاتے کھاتے ان کا دل بھر گیا تھا۔ سرلا کی ماں کے ہاتھ کا ذائقہ تو اب انہیں یاد بھی نہیں۔ اس کا نام بھی تو یاد نہیں ـــــ ان کا جی چاہا کہ جلدی سے پوچھ لیں۔

''بیٹی تمہاری ماں کا کیا نام تھا۔''

''ارے یہ کیا۔ اگر اس طرح وہ کوئی سوال کریں گے تو یہ دونوں کیا سوچیں گے۔ دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں گے ـــــ'' کیدارناتھ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے کہ کہیں بھول کر یہ سوال ان کے منہ سے نہ نکل پڑے ـــــ ''کس سے

پوچھوں؟ کمبخت خود ہی میرے ذہن میں آجائے تو پوچھنا ہی کیوں پڑے؟'' انہوں نے بھنویں سکوڑیں، پیشانی پر بے شمار بل پڑ گئے پھر آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ذہن سے جوجھنے لگے۔ ''آج سرلا کا بیٹا نظر نہیں آرہا ہے، شاید اسے اپنی نانی کا نام یاد ہو —— باتوں باتوں میں اس سے تو پوچھ ہی لوں گا —— '' ''سرلا آج تمہارا بیٹا............؟''

''ہاں پتا جی میں تو بتانا بھول ہی گئی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اس نے کمپیٹشن کی تیاری شروع کردی تھی۔ کل سے اس کے امتحان ہیں۔ دو دن پہلے ہی دلی چلا گیا ہے—— '' ''او.......... اچھا........... تو گھر پر نہیں ہے۔'' کیدارناتھ ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر کھانے میں مصروف ہوگئے۔ کھانا ختم ہوگیا اور کیدارناتھ کو اپنی بیوی کا نام یاد نہیں آیا۔ کھانے کے بعد چائے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شام ہوگئی۔ کیدارناتھ بغیر نام پوچھے ہی وہاں سے اٹھ پڑے۔ گھر لوٹنے کے لیے بس پکڑی۔ اب ان کے جسم کی ساری رگیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ ہر ایک شخص کو دیکھ کر انہیں لگتا کہ اسے ضرور میری بیوی کا نام معلوم ہوگا۔ وہ ہر ایک سے پوچھنا چاہتے ہیں مگر کوئی شخص نہ تو ان کی طرف متوجہ ہوتا اور نہ ہی کچھ پوچھنے کے لیے ان کے ہونٹ کھلتے۔ سفر جاری رہا اور پھر اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ بس رکی۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور اترنے کے لیے سیٹ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

کمرے میں چاروں طرف اندھیرا ہے۔ وہ بغیر روشنی کیے بستر پر ڈھیر ہوگئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا، کیدارناتھ کو محسوس ہوا کہ دیواریں ان کی طرف کھسکتی چلی آرہی ہیں۔ انہوں نے آنکھوں پر زور دے کر دیواروں کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ پورے کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ ''اٹھ کر لائٹ جلا دی جائے۔'' انہوں نے سوچا۔ مگر روشنی میں تو انہیں نیند ہی نہیں آتی۔ اندھیرے میں بھی کب آتی ہے۔ اب ان کی آنکھیں شعلوں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔ جسم سے بھی آگ نکلنے لگے گی۔ آگ کی لپٹیں بہت تیز ہوگئی ہیں۔ سرلا کی ماں کی چتا جل رہی ہے، روشنی بہت تیز ہے اور انہیں نیند نہیں آرہی ہے۔ تو پھر آنکھیں نیند سے بوجھل کیوں ہوتی جارہی ہیں —— ؟ جگہ جگہ سے جسم گل گیا ہے۔ وہ جدھر کروٹ لیتے ہیں ادھر ہی سے شدید درد کی لہر اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے ہوتے جارہے تھے کہ اچانک ذہن سے کوئی چیز نکل کر پلنگ کے نیچے فرش پر جا پڑی۔ کیدارناتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ لائٹ جلائی اور الماری کھول کر تمام کتابیں فرش

پر بکھیر دیں۔ایک ایک کر کے میز کی دراز کے تمام کاغذات نکال ڈالے اور پرانے بکس سے کچھ فائلیں نکالیں پھر دیوانوں کی طرح انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے ـــــــ کسی کاغذ کو پڑھتے، کسی کو پھاڑ کر پھینک دیتے اور کسی کو تہہ کر کے رکھ لیتے۔ ''کمبخت اس کی کوئی چٹھی بھی تو نہیں مل رہی ہے۔'' اب کیدار ناتھ نے جھنجھلا کر کتابوں، کاغذوں اور فائلوں کو نوچ کر پھینکنا شروع کر دیا ہے۔ دونوں ہاتھ بالکل شل ہو چکے ہیں۔ سانس رکنے لگی ہے۔انہوں نے گھبرا کر گلے میں بندھے مفلر کا بل کھولنا چاہا کہ پتا نہیں کیسے گرفت اور تنگ ہوگئی پھر ایک جھٹکے کے ساتھ مفلر کھینچ لیا اور بری طرح ہانپنے لگے۔

''ڈھونڈنے سے کوئی فائدہ نہیں ـــــــ یاد کرنا بھی بیکار ہے، اب کچھ یاد نہیں آئے گا۔'' اور وہ یاد کرنے لگے کہ ان کی بیوی کا کیا نام تھا۔

شانتی.............؟

نہیں ـــــــ

سروجنی ـــــــ

نہیں.............نہیں.............

سرشٹھا.............؟

اُف یہ بھی نہیں ـــــــ

ہزاروں نام ان کے ذہن میں تیزی سے آنے لگے۔ پھر وہ بھول گئے کہ وہ کیا یاد کر رہے تھے۔

آج کون سا دن ہے؟

اتوار ـــــــ

نہیں اتوار تو کل تھا۔

کل ؟

اتوار تو اس دن تھا جب وہ سرلا کے گھر گئے تھے اور سرلا کے گھر گئے ہوئے اب صدیاں گزر چکی ہیں۔

ان کی آنکھوں سے زرد روشنائی ٹپک کر پورے کمرے میں پھیل گئی ہے۔ کتابیں، کاغذات اور فائلیں ـــــــ کچھ دھندلے دھندلے حروف نظر آئے۔

''شرما۔ ہاں میرے دفتر کے ساتھی شرما۔''

''پورا نام کیا تھا ان کا؟''

''یہ بھی بھول گیا؟''

''اور ان کے بیٹے کا؟''

''نہیں، اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔''

پارک ——

''کون سا پارک''؟

''ہاں وہی پارک جہاں وہ کھڑی مسکرا رہی ہے۔''

''لیکن اب تو اس پارک کا نام بھی بدل گیا ہے۔''

''کیا ہے اس کا نیا نام؟''

''نیا ہی کیا اب تو پرانا بھی یاد نہیں۔ میں سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں۔''

''میری بیٹی —— ''

''اف اس کا نام بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔''

''اس کے شوہر کا نام؟''

''ہے بھگوان مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو کچھ بھی یاد نہیں۔''

کیا صرف بیوی کے نام کے لیے وہ اتنے پریشان ہیں۔

نہیں، کوئی اور چیز بھی ہے جسے وہ بھول گئے ہیں۔

''کیا چیز ہے وہ؟''

وہ نیم پلیٹ جو بار بار ان کے ذہن سے نکل کر گر پڑتی ہے! کیا لکھا ہے اس میں؟ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سب کچھ مٹ چکا ہے ——

دیواریں، چھت، دروازے اور فرش .... کچھ بھی نہیں ہے۔ دور تک پھیلا ہوا ایک بہت بڑا میدان ہے۔ زمین میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ سورج کا گولا پھیل کر اتنا بڑا ہو گیا کہ پورا آسمان اس کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ روشنی اتنی تیز ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ اچانک دور کوئی بہت چھوٹی سی چیز نظر آئی۔

''کیا ہے وہ ؟''

''کوئی انسان ہے جو اپنے چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے قریب کوئی بھی نہیں ہے، وہ تنہا ہے، بالکل تنہا۔''

''ارے وہ تو میری طرف بڑھ رہا ہے، اور اب میری آنکھوں کے اتنا قریب آ گیا کہ اس کے پیچھے سارا میدان، آسمان اور سورج کا پھیلا ہوا گولا بھی چھپ گیا ہے۔''

''کون ہے یہ شخص؟''

''میں؟'' اور ان کی آنکھوں کے سامنے خود ان کی اپنی ذات اندھیرا بن کے چھانے لگی۔

''مگر میں کون ہوں؟ کیا نام ہے میرا؟''

''ایں............اب تو میں اپنا نام بھی بھول گیا۔'' وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے چیخے اور بغیر ریڑھ کی ہڈی والے آدمی کی طرح دہرے ہوتے ہوتے اپنے آپ میں سمٹنے لگے۔ انہیں لگا کہ وہ کئی گز زمین کے اندر دھنس گئے ہیں۔ ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ سر بری طرح چکرانے لگا اور آنکھوں میں نیلے پیلے بادل اُمنڈ آئے۔ ہاتھ پاؤں سُن پڑ چکے ہیں اور گلا رندھ گیا ہے، جیسے کوئی بہت موٹی سی چیز اس میں اٹک گئی ہو۔ کانپتا ہوا ہاتھ انہوں نے گردن پر رکھ لیا اور کھنکارنا چاہا مگر انہیں لگا کہ کھنکارتے ہی ہچکی آ جائے گی اور وہ مر جائیں گے۔

''نہیں............'' وہ بہت زور سے چیخے۔ ان کے ہاتھ کی گرفت گلے پر خود بخود مضبوط ہو گئی تھی۔ دھندلے دھندلے حروف ابھرنے لگے۔

''کے............کے............'' اُف لگتا ہے دماغ کے پرخچے اڑ جائیں گے اور زبان کٹ کر دور جا گرے گی۔ انہوں نے غور سے دیکھا، حرف کچھ کچھ صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ ''کے دا اا..............''

اور پھر انہوں نے پڑھ لیا۔ ''کیدار ناتھ۔'' وہ خوشی سے چیخ پڑے اور گلے پر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دل بہت زور سے دھڑکا، پورے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے پلنگ پر جا پڑے۔

''کیدار ناتھ، کیدار ناتھ ————'' وہ زور زور سے کہنے لگے جیسے اب انہیں سب کچھ یاد آ گیا ہو۔

اپنی بیٹی کا، دوست کا، اس پارک کا اور اپنی بیوی کا نام ـــــــــ کیدار ناتھ!

محسوس ہوا کہ ساری دنیا کا نام کیدار ناتھ ہے۔

پھر آہستہ سے اٹھے، لائٹ بجھائی اور کیدار ناتھ، کیدار ناتھ کہتے ہوئے لحاف میں گھس گئے۔

صبح ہوئی تو انہوں نے خود کو بہت مطمئن محسوس کیا۔ رات بہت گہری اور سکون کی نیند آئی تھی۔!!

○○○

شیشے کی کرچیں

وارڈ کے سب مریض گہری نیند سوتے رہے اور وہ صبح کے انتظار میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح ہوتے ہی مریم اپنی ٹیم کے ساتھ سفید ایپرن پہنے، گلے میں آلہ لٹکائے آہستہ سے آئے گی اور پوچھے گی۔

''کوئی پرابلم؟''

''جی نہیں ڈاکٹر — '' وہ ہمیشہ یہی کہتا لیکن مریم اس جواب سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی اور بیڈ سے لٹکی کیس شیٹ پڑھنے لگتی۔ انویسٹی گیشن رپورٹیں، ٹیمپریچر چارٹ اور ٹریٹمنٹ کارڈ دیکھتے وقت اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھرمامیٹر کے پارے کی طرح بڑھنے گھٹنے لگتے۔ جس دن اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ کر دھیرے سے آنکھوں پر لے آتی تو وہ سمجھ جاتا کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب وہ مریم کے ہاتھ کی نرمی اور سختی سے اپنی حالت کا اچھی

طرح اندازہ لگانے لگا تھا۔

'عجیب مرض ہے، جوں جوں بڑھتا ہے، تکلیف کا احساس مٹتا جاتا ہے۔ مریم بھی کچھ نہیں بتاتی ...... وہ ہمیشہ خاموش رہتی ہے مگر ہر بار لگتا ہے کہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

سچ ___؟

لیکن مجھ سے آج تک کسی نے کچھ نہیں کہا ___ میری ماں نے بھی نہیں۔ باپ کو تو خیر میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اب ماں کی شکل بھی دھندلی ہوتی جارہی ہے۔ کس کس طرح سے میں نے ان آنکھوں کو سلامت رکھا ہے۔ میں دنیا کو پہچانتا ہوں مگر دنیا مجھے نہیں پہچانتی، سوائے مریم کے۔ وہ مجھے دیکھتی ہے، ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے اور کچھ کہنا بھی چاہتی ہے۔ آخر کیا کہنا چاہتی ہے وہ...............؟'

''وہ...........وہ''۔ لگاتار ''وہ............وہ'' اور پھر ایک ہی تال پر ''وہ......وہ'' کا طویل سلسلہ۔ گویا اس کے سینے میں دل نہیں ''وہ'' دھڑک رہی ہو۔

''اگر اس نے کچھ کہہ دیا تو............''

''تو کیا؟ یا تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا' یا پھر اسی وقت مر جاؤں گا۔''

''تو میرے مرنے کے ساتھ ہی وہ بھی مر جائے گی؟ وہ جو ایک آواز ہے۔ وہ جو میرے سینے کے اندر ہے''۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں___

صبح ہو گئی تھی۔ وارڈ بوائے نے مریضوں کو ناشتہ دینا شروع کر دیا تھا۔ ماحول اداس اور فضا خاموش تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ سارے مریض اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کوئی ناشتہ کر رہا تھا' کوئی ابھی تک چادر تانے سو رہا تھا تو کوئی وارڈ میں بے مقصد ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا کہ ایک زوردار چھناکا ہوا۔ آج پھر اس سرپھرے مریض نے چائے پی کر گلاس دیوار سے دے مارا تھا۔ چاروں طرف شیشے کی کرچیں بکھر گئی تھیں۔ وہ دور لیٹا یہ منظر دیکھتا رہا، پھر لیٹے ہی لیٹے نظروں سے کرچوں کو سمیٹنا شروع کیا تو اسے لگا کہ وہ شیشے کی کرچوں کو نہیں اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ رہا ہے ___ اتنے میں ڈاکٹر مریم کیبن سے نکل کر سرپھرے مریض کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

''ڈاکٹر مجھے کیا ہو جاتا ہے؟''

''کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر رابرٹ راؤنڈ پر آرہے ہوں گے۔ شاید کوئی دوا بدلیں۔''
ڈاکٹر مریم نے مریض کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ وہ بھی سائڈ ریک پر رکھا گلدان دیوار سے دے مارے اور .... مگر وہ ایسا نہ کر سکا، کیوں کہ اسی لمحے ڈاکٹر مریم کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ قریب آکر بولی۔

''تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مسٹر......'' نام دیکھنے کے لیے کیس شیٹ پر نظر ڈالی۔

''مریم تو دوسرے ڈاکٹروں سے الگ ہے پھر بھی نام............؟''

''ہاں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' ڈاکٹر مریم نے پھر کہا اور خاموشی سے چلی گئی۔

''میں اس کا مطلب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے یعنی جلد ہی مر جاؤ گے۔ بس چند روز اور............''

ڈاکٹر رابرٹ راؤنڈ پر آگئے تھے۔ مریم بھی ان کے ساتھ تھی۔

''وہ کسی بھی مریض کو دیکھ رہی ہو ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال لیتی ہے۔ اب وہ لوگ ادھر ہی آرہے ہیں، مریم کی چال دھیمی کیوں ہونے لگی............؟ ارے وہ تو اپنے کیبن میں جارہی ہے۔ کیا میرے پاس نہیں آئے گی۔ جاتے جاتے ایک بار پھر اس نے مجھے دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں جس کے بچنے کی امید نہیں ہوتی، وہ اس کے پاس آنا کم کر دیتی ہے۔ ابھی تک اس کا دل ڈاکٹروں کے دل کی طرح سخت نہیں ہو پایا ہے۔''

ڈاکٹر رابرٹ ایک ایک کر کے مریضوں کو دیکھتے ہوئے اس کے بستر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ جب ڈاکٹر رابرٹ کسی مریض کی تمام رپورٹیں، ایکس رے پلیٹیں اور پوری کیس ہسٹری اپنی ٹیم کے سارے ڈاکٹروں کو دکھاتے ہیں، کچھ دیر سمجھاتے ہیں اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر اس مریض کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں تو سمجھیے کہ وہ دن اس مریض کی زندگی کا آخری دن ہے۔

''آج کس کی باری ہے......؟ اس سر پھرے مریض کی......؟ نہیں، اسے تو آج دیکھا بھی نہیں، بس آگے بڑھ گئے۔ پھر کون ہے جو آج مرنے والا ہے۔ میں ؟''

اور پھر اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر رابرٹ اپنے جونیرس کے ساتھ اس کے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے۔ رپورٹیں دیکھیں، کیس ہسٹری پڑھ کر سب کو سنائی۔ وہ کانپنے لگا تو ڈاکٹر

رابرٹ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں ....'' آواز اس کے اندر گھٹ کر رہ گئی۔

''نرس، ہیموگلوبن ٹیسٹ کرو۔ ڈرپ چڑھانے کا انتظام کرو اور آکسیجن سیلنڈر اسٹور سے نکال کر یہیں رکھ لو..........''

اس کے سینے میں درد کی لہر اٹھی اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو اس نے پورے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا، جیسے مرنے کی تیاری کر رہا ہو۔

رات میں کسی وقت درد کی شدت سے آنکھ کھل گئی۔ دم گھٹنے لگا، فضا میں ہوا جیسے تھی ہی نہیں۔ زخمی پرندے کی طرح ہاتھ پاؤں پھڑ پھڑائے اور بہت مشکل سے بھاری پپوٹوں کو تھوڑا سا ہٹانے میں کامیاب ہو سکا۔ دیکھا کہ اس کے چاروں طرف ہرے پردے کا کیبن بنا ہوا ہے، ایک نرس اسٹول پر بیٹھی اونگھ رہی ہے، اور پھر نرس کی گردن نیند سے ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ نرس کا چہرہ دھندلا پڑنے لگا اور ڈاکٹر مریم کا چہرہ ابھر آیا۔

ڈاکٹر مریم ...... نہیں میری مریم ......!'' مریم اب سو جاؤ۔ مجھے بھی بہت نیند آ رہی ہے۔'' پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ لمحے بھر کو اندھیرا چھایا مگر پھر پتلیوں سے تیز روشنی پھوٹی اور اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ صبح ہو رہی ہے اور وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ناشتے کی میز پر بیٹھا مریم کا انتظار کر رہا ہے۔ مریم آئی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''تم اتنے تنہا کیوں رہتے ہو؟'' یہی سوال ایک بار اس کے ایک دوست نے کیا تھا۔

''مجھے تنہائی پسند ہے۔ ابھی تک مجھے ایسا کچھ نہیں ملا جو..........''

''ملے گا۔''

اس نے کہا تھا'' ملے گا'' اور آج مل بھی گیا، مریم کی شکل میں، اس طرح کے سوال کرنے والا ایک دوست۔

دوست؟

''لیکن وہ تو ایک ڈاکٹر ہے۔ مجھ سے نہیں میرے مرض سے اس کا رشتہ ہے۔''

اس نے ذہن سے مریم کے خیال کو جھٹکنا چاہا۔ آنکھیں کھولیں تو نظر اسپتال کی بالکونی پر پڑی۔ بالکونی بالکل سونی اور خالی تھی۔ تھوڑی دیر یوں ہی گھورتا رہا پھر آنکھیں بند کیں تو

اس یتیم خانے کے ایک کونے سے، جہاں بچپن گزارا تھا، ایک چھوٹا سا خوبصورت فلیٹ ابھرتا نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اور مریم اس چھوٹے سے فلیٹ کی بالکونی میں آ کر بیٹھ گئے ہیں۔

''مریم وہ کتنا حسین لمحہ ہوگا جب خدا نے تمہیں بنانے کی پلاننگ کی ہوگی۔''

''اور وہ لمحہ؟ جب میری قسمت میں آپ کو لکھا ہوگا۔''

''پتا نہیں وہ لمحہ اچھا تھا یا برا۔''

''برا۔'' وہ جلدی سے بول پڑی اور دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

''میں اسپتال جا رہی ہوں، لوٹتے میں ڈرائنگ روم کے لیے پردے لیتی آؤں گی۔''

''کلر؟''

''ہاں بھئی مجھے آپ کی پسند معلوم ہے۔''

''اوکے''

''ٹھیک ہے اب میں تیار ہوتی ہوں۔ جاؤں؟'' مسکراتے ہوئے بولی۔

جب مریم بادامی رنگ کی ساڑی پہن کر ڈرائنگ روم میں آئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''اتنی خوبصورت ہے مریم؟ مریم بھی خوب ہے کبھی تو دکھائی ہی نہیں دیتی اور جب دکھائی دیتی ہے تو اتنا کہ........''

اس کی رگوں میں تناؤ محسوس ہوا، جیسے بدن سے جان نکل رہی ہو۔ پوری طاقت سے خود کو سنبھالا۔ ڈرائنگ روم کے آسمانی پردے آنکھوں کے بہت قریب آ کر لہرانے لگے۔ اب پردوں کا رنگ بدلنے لگا تھا اور اسپتال کے ہرے پردوں کا دائرہ تنگ ہو گیا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا لیکن لگا کہ ایک طویل نیند کے بعد ابھی ابھی جاگا ہے۔ نرس اسٹول پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ گلوکوز قطرہ قطرہ اس کے جسم میں اتر رہا تھا اور ڈاکٹر مریم اپنے کیبن میں سو چکی تھی۔ اسے یاد آیا کہ آج ڈاکٹر رابرٹ نے اپنی ٹیم کے ساتھ آ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''نہیں........''

سانسیں اکھڑنے لگیں۔ نرس نے آکسیجن کا سلینڈر سنبھالا۔ اس کی نظروں میں چھوٹا سا فلیٹ ہنڈولے کی طرح جھولنے لگا۔

''نہیں ......میں مریم کو، اپنے گھر کو، اس ڈرائنگ روم کو جسے میں نے مریم کے ساتھ مل کر، یا شاید اکیلے ہی سجایا ہے اور اس خوبصورت زندگی کو جس نے میرے اندر ڈھیرے ڈھیرے جنم لیا ہے، چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

آج رات سے پہلے جب مریم میری زندگی میں نہیں تھی تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ یہ گھر، نہ ڈرائنگ روم، نہ پردے اور نہ میں۔ مگر اب یہ دنیا میرے لیے ایک خوبصورت پینٹنگ کی طرح ہے، دیوار پر لگی ایک پینٹنگ۔ ابھی ایک لمحے پہلے یہ پینٹنگ خریدتے وقت مریم سے کتنا جھگڑا ہوا تھا۔

''تم صرف ڈاکٹر ہو۔ سارا وقت اسپتال میں گزارتی ہو۔ تمہارا ٹیسٹ بالکل خراب ہو گیا ہے۔ تمہیں اچھی چیز پسند ہی نہیں آتی۔''

مریم نے میری طرف کتنے پیار سے دیکھا تھا اور آنکھیں اس طرح جھپکی تھیں جیسے کہہ رہی ہو۔

''میری پسند تو تم ہو ــــ''

اور پھر ہم پینٹنگ کو دیوار پر لگا کر صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔''

ہرے پردوں کا دائرہ بہت تنگ ہو گیا تھا۔ فلیٹ اب بھی ہنڈولے کی طرح جھول رہا تھا، کھڑکی کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور کرچیں اس کی آنکھوں میں بھر گئی تھیں۔ کھڑکی سے دکھائی دینے والا صوفہ سکڑ کر اسپتال کے تین پایوں والے اسٹول کی شکل اختیار کر چکا تھا، جس پر نرس بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

''صوفہ کہاں غائب ہو گیا؟ اس پر بیٹھی مریم کہاں چلی گئی؟ یہ آنکھوں میں اندھیرا کیوں چھانے لگا ہے؟ میرا گھر کہاں گیا؟ تو کیا میں ....؟ نہیں میں ابھی مر نہیں سکتا۔ مریم، میری مریم، میرے بغیر ....! نہیں میں اسے اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں، مجھے رکنا ہوگا۔ مریم ....''

''یس سر .... کیا بات ہے؟ ڈاکٹر مریم کو بلاؤں ....؟''

''نہیں .... ڈاکٹر کو نہیں میری ....'' نرس نے دیکھا کہ اس نے کچھ اور بھی کہنے کی کوشش کی مگر ہونٹ محض پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"کہیں سانس نکل نہ جائے۔" وہ تھوڑے وقفے کے لیے سانس روکنے لگا، نرس سمجھی کہ دم نکل رہا ہے۔ سانس رکتی رہی اور چلتی رہی اور جب دل کی دھڑکنیں کئی روز تک "مریم مریم میری مریم" کی لے پر چلتے چلتے رواں ہوگئیں تو ڈاکٹروں کو اس کے زندہ بچ جانے پر شدید حیرت ہوئی۔

"کرشمہ ہوگیا مریم! اس مریض کی حالت بہتر ہوتی جارہی ہے۔" ڈاکٹر رابرٹ نے مریم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کئی دنوں تک ڈاکٹروں نے اس پر خصوصی توجہ دی، مختلف انویسٹی گیشن ہوئے، ہر طرح کی جانچ کے بعد بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ مریض نے اپنے اندر غیر معمولی ریزسٹینس پیدا کرلیا ہے۔ اب وہ غیر معمولی طور پر خوش مزاج بھی ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی مریم سے مذاق بھی کرلیتا۔ وہ بھی مسکرا کر جواب دیتی۔ کئی روز تک دل ہی دل میں ان جملوں کو ترتیب دیتا رہتا جو اسے مریم سے کہنے ہوتے۔ وہ چاہتا کہ ایسی بات کہے جس سے اس کے دل کی حالت بھی بیان ہوجائے اور مریم برا بھی نہ مانے۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ جب بھی مریم ڈاکٹر رابرٹ کے ساتھ ڈیوٹی پر ہوتی تو اسے سب سے بڑی دشمن نظر آتی، اس سے نفرت ہونے لگتی، جی چاہتا کہ وہ مریم کو قتل کردے۔ وہ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا مگر ایک روز جب اس نے دیکھا کہ مریم اس کے بستر کے پاس کھڑی رپورٹیں دیکھنے کے بجائے خود سپردگی کے انداز میں ڈاکٹر رابرٹ کی آنکھوں میں جھانک رہی ہے اور ڈاکٹر رابرٹ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے دبا دیا ہے، تو وہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکا اور سرہانے رکھے گل دان کو دیوار پر اتنی زور سے دے مارا کہ کانچ کا ایک بڑا ٹکڑا اچٹ کر مریم کے ماتھے پر جا لگا اور چہرے پر خون کی ایک لکیر کھنچ گئی۔ ڈاکٹر رابرٹ نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس مریض کو ڈسچارج کردینا چاہیے۔ اب یہ ہمارا کیس نہیں، کسی مینٹل.........."

"نہیں رابرٹ اسے دوبارہ زندگی ملی ہے۔ اسے اپنی پچھلی زندگی سے نئی زندگی کی کڑیاں ملانے میں دقت ہورہی ہے۔ اگر ہم بھی.........." "اور پھر تم اچھی طرح جانتے ہو کہ علاج رکنے پر یہ بچ نہیں پائے گا۔"

"مریم تم اسے کچھ زیادہ ہی.........."

''اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی ہے رابرٹ، اور جانتے ہو اس نے اپنی کہانی صرف مجھے سنائی ہے۔ جب میں نے کرسمس پر اسے ایک رومال لا کر دیا تھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ اسی رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔''

''پہلی بار نکلے ہیں۔ اس میں بھی ایک مزہ ہوتا ہے، مجھے احساس ہی نہیں تھا۔''

رابرٹ نے جیب سے رومال نکال کر مریم کے ماتھے کا خون پونچھا۔ ''چلو پہلے ڈریسنگ کروالو۔'' اور وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ کئی دن بعد جب مریم آئی تو وہ نظریں جھکائے بستر پر بیٹھا تھا۔ مریم قریب آکر کھڑی ہوگئی، وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ مریم نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ویری گڈ۔ مجھے یقین ہے اگر تم اسی طرح بیماری سے لڑتے رہے تو ایک دن بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

اس نے مریم کی طرف دیکھا، دل میں خواہش جاگی کہ اس کے ماتھے پر بندھی پٹی کو سہلائے۔ ہاتھ اٹھا مگر کپکپا کر رہ گیا۔

''اسی طرح بیماری سے لڑتے رہے تو ایک دن بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' مریم کا جملہ ذہن میں گونجنے لگا۔

''کیا میں سچ مچ ٹھیک ہو جاؤں گا!''

یہ خیال مزید پریشانی کا باعث بنا۔ وہ دن بھر بے چینی کی حالت میں ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ شام ہونے کو تھی، ہوا تھمنے لگی تھی، مگر کبھی کبھی تازہ پھولوں کی خوشبو لیے ہوا کا جھونکا کھڑکی سے داخل ہوتا لیکن وارڈ کی بیمار فضا سے گزر کر اس کے بستر تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتا اور اسے احساس ہو جاتا کہ یہ اسپتال ہے، ہنڈولے کی طرح جھولتا کوئی خوبصورت فلیٹ نہیں۔ اس نے وارڈ میں چاروں طرف نظریں گھمائیں، اب پوری طرح شام ہو چکی تھی۔ مدھم روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر یوکلپٹس کے درخت کی شاخیں جھول رہی تھیں۔ وہ اٹھا اور ٹہلتا ہوا بالکونی میں چلا گیا۔ نیچے دور تک سیاہی مائل سبزہ پھیلا ہوا تھا۔

''باہر زندگی کتنی خوبصورت ہے؟'' یہ خیال آتے ہی اسے اپنا جسم روح کا اندھیرا قید خانہ محسوس ہوا۔ وارڈ کے نیچے دور تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اندھیرے میں بنتے مٹتے سائے پھر اسی ہنڈولے کی طرح جھولتے فلیٹ کی سی شکل اختیار کرنے لگے ہیں۔

مریم نے مہین نائٹی پہن رکھی ہے۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنی انگلیاں مریم کے بالوں میں پروئیں۔

''یا تو یہ مریم کے بال نہیں یا میری انگلیاں نہیں۔'' غور سے دیکھا رابرٹ بڑے پیار سے مریم کی زلفیں سہلا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں لٹکا فانوس اچانک گل ہو گیا۔ فانوس گل ہوتے ہی اندھیرا چھانے کے بجائے اس کی آنکھیں تیز روشنی سے چندھیا گئیں۔ دراصل نرس نے اسپتال کی بالکونی میں لگے بلب کو روشن کر دیا تھا اور بالکونی کا بلب روشن ہوتے ہی فلیٹ کا فانوس گل ہو گیا تھا۔

''آپ یہاں......؟ بہت رات ہو گئی ہے، اب آرام............''

''نرس، ڈاکٹر مریم آج بھی رات کی ڈیوٹی پر نہیں ہیں نا۔''

''ہیں۔ بہت سی کتابیں لیے بیٹھی ہیں اور آپ کی فائل منگائی ہے۔''

''اکیلی ہیں؟''

''نہیں ڈاکٹر رابرٹ بھی ہیں۔''

''رابرٹ..........؟''

''ہاں، وہ اکثر رات کو آدھے ایک گھنٹے کے لیے وارڈ میں آجاتے ہیں، اگر ڈاکٹر مریم ڈیوٹی پر ہوں......'' نرس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ بالکونی میں لگا بلب خود بخود بجھ گیا یا اس نے سوئچ آف کر دیا تھا، نرس یہ نہیں دیکھ پائی اور مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس کے بعد کئی دن تک اسے نیند نہیں آئی۔ دل کی رفتار میں فرق آ گیا تھا۔ آج رات بھی وہ بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ ڈیوٹی روم میں مریم اور رابرٹ کافی پی رہے تھے۔ باہر موسم خراب تھا۔ ہوا کے تیز جھونکے وارڈ کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہے تھے کہ ایک زوردار چھناکا ہوا۔ ایک کھڑکی کے شیشے ٹوٹ کر بالکونی کے نیچے بکھر گئے، وہ اٹھا اور جھانک کر دیکھا، شیشے کی کرچیں منہ اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ نہ فلیٹ ہے، نہ ڈرائنگ روم۔ نہ دیوار پر لگی پینٹنگ ہے، نہ مریم اور نہ وہ خود۔ صرف شیشے کی کرچیں ہیں اور کچھ نہیں۔ وہ دیر تک شیشے کی بکھری کرچوں کو گھورتا رہا۔ رابرٹ اور مریم دونوں نے اسے بالکونی میں کھڑا دیکھا۔

''رابرٹ چلو باہر چلتے ہیں۔''

''اس موسم میں؟ کہاں؟''

''کہیں بھی۔ کینٹین۔''

''ابھی تو کافی پی ہے۔''

''چلو بھی، کہیں بھی چلتے ہیں۔ بس باہر۔''

''ہوں۔''

اور وہ دونوں وارڈ کی سیڑھیاں اترتے اسپتال سے باہر نکل آئے۔

''مریم، ہوا کی سنسناہٹ میں بھی ایک رومانس ہوتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے!''

''ہوسکتا ہے کیا مطلب، ہوتا ہے۔''

''رابرٹ جب ہوا تیز چلتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ سب کچھ ایک ہی رفتار سے چل رہا ہے، یعنی سب کچھ اپنی جگہ ٹھہر گیا ہے۔ دل پر چھائی اداسی کی طرح۔''

''پتا نہیں!'' رابرٹ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''رابرٹ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں اور وہ بھی اسپتال کے ایٹموسفیئر سے دور۔''

''تو چلو نائٹ کلب چلتے ہیں۔''

''نہیں، وہاں بہت بھیڑ ہوتی ہے۔ کسی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔''

''ریگل؟''

''ہاں ٹھیک ہے''۔ اور وہ دونوں ریگل کے ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ ریستوراں کے نیم تاریک ماحول میں دونوں تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔

مریم نے رابرٹ کے چہرے پر نظریں جمائیں۔ وہ بہت بیمار لگ رہا تھا۔ رابرٹ ہی کیوں آج تو اسے ہر شخص بیمار لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ بیماروں کے لیے ہمدردی اور خدمت کا جذبہ پہلی بار اس کے دل میں پیدا ہوا ہے۔ ہاتھ کپکپانے لگا اور دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا رابرٹ کے ہاتھ کے اوپر جا کر ٹھہر گیا۔

''کیا بات ہے مریم؟''

''میں بہت الجھن میں ہوں۔''

''کیوں ——؟''

''رابرٹ.........کیا تم.........آئی مین.........''

''لیس، میں.........میں.........آئی مین......آئی لویو۔''

مریم کو لگا کہ رابرٹ کا ہاتھ انگارے کی طرح دہک رہا ہے۔ میز پر رکھی کافی کی پیالیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ جھاگ بیٹھتے جا رہے تھے کہ مریم رابرٹ کی طرف جھکی اور اس کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے بولی۔ ''جتنا تم میرے قریب آ رہے ہو، میں تم سے دور ہوتی جا رہی ہوں۔''

رابرٹ نے اپنی گرم ہتھیلی سے مریم کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے کیا کہا، یہ تو وہ سن نہیں سکی لیکن اب اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

''میں سمجھتا تھا تم مضبوط عورت ہو۔''

''اتنی کمزور بھی نہیں ہوں، لیکن سب اتنے مضبوط نہیں ہوتے۔''

''سب کون؟'' رابرٹ نے کافی کی پیالی اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

''رابرٹ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' پیالی کو ہونٹوں تک لے جاتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ بغیر سپ لیے ہی پیالی کو میز پر رکھ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

مریم نے اپنے ماتھے پر لگی چوٹ کے نشان کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت کمزور ہے۔''

''وہ......وہ کون؟ تم اس کا نام جانتی ہو؟''

''ہاں......وہ.........وہ ایک مریض ہے۔''

''یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ صرف ایک مریض ہے۔ کچھ دن میں ٹھیک ہو کر چلا جائے گا۔''

''نہیں رابرٹ، وہ جب تک ٹھیک نہیں ہو رہا ہے، تبھی تک زندہ ہے۔ جس دن ٹھیک ہو گیا، مر جائے گا۔ میں نے اس کے درد کو محسوس کیا ہے، اسے سمجھا ہے۔ وہ اپنی ایک دنیا

بسا چکا ہے۔ اس کے ٹھیک ہوتے ہی شاید وہ دنیا اجڑ جائے گی اور..........''

''مریم اسے سمجھاؤ، وہ تمہاری بات سمجھتا ہے۔ وہ دنیا خوابوں کی دنیا ہے، اصل دنیا نہیں۔''

''بات اسے سمجھانے کی نہیں، تم سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں..........؟''

''ہاں رابرٹ۔ میری محبت اپنے آپ میں کچھ نہیں ہے۔ اس کا ہونا نہ ہونا کسی کی ضرورت پر ڈپینڈ کرتا ہے، اور اسے میری ضرورت ہے۔''

''مریم تم نے زندگی کو سمجھا ہی نہیں۔ جذباتی ہو کر زندگی کو سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ ہم ڈاکٹر ضرور ہیں۔ مریضوں کے لیے بہت کچھ کرنا ہماری ڈیوٹی ہے مگر ہماری بھی زندگی ہے۔ ہم اسے اپنے ڈھنگ سے گزارتے ہیں۔''

''رابرٹ نہیں۔ شاید زندگی وہ نہیں جو ہم گزار رہے ہیں، اصل زندگی وہی ہے جو وہ جی رہا ہے۔''

رابرٹ ہنس دیا اور مریم کو آغوش میں سمیٹتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

''اس میں ایسا کیا ہے، جو ہم میں نہیں..........؟'' یہ پوچھ کر شاید اس نے سنجیدگی کو توڑنے اور موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن مریم نے مزید سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

''پتا نہیں؟ بس اتنا جانتی ہوں کہ جب وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھتا ہے تو اس کے اندر آگ سلگنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھلکتی ہے۔ اس وقت مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے وہ میرا گلا دبا دے''۔ رابرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا، دوسری میزوں پر بیٹھے لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور وہ گھبرا کر باہر لان کی طرف جھانکنے لگا۔

''ہوا تھم گئی ہے، لان میں چلتے ہیں۔''

لان میں ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول تھا۔ صاف شفاف پانی میں چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ جو چاند آسمان پر سفید تھا وہ پانی میں زرد دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان کے چاند اور پانی کے چاند کے فرق سے مریم اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ رابرٹ مریم کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ مریم کے ہونٹ کپکپائے، آنکھیں بند ہونے لگیں تو رابرٹ نے

اپنے سخت ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ مریم نے آنکھیں کھولیں اور آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند کا رنگ اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ مریم نے رابرٹ کے بالوں کو مٹھی میں بھرا اور اس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں دبا لیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھے چاند کے زرد عکس کو گھور رہے تھے۔

''پتا نہیں رابرٹ، سچ کیا ہے؟ وہ بھی سچ ہے'' آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی سچ ہے۔'' پانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم جانتی ہو ہم جلدی ہی شادی کرنے والے ہیں۔ پھر یہ سب..........؟''

''رابرٹ اگر میں تم سے شادی کر بھی لوں تو یہ اسی طرح ہوگا جیسے ہم پانی کے چاند کو دیکھ کر سمجھیں کہ یہ ہماری دنیا میں روشنی بکھیر رہا ہے اور یہ بھول جائیں کہ اصل چاند تو آسمان میں ہے، ہم سے بہت دور۔''

''لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم اس چاند کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو جو ہے ہی نہیں۔''

اچھا مریم اب اس بات کو یہیں ختم کرو۔''

''میں بھی یہی کہتی ہوں، اس بات کو یہیں ختم کرو۔''

''مریم..........'' اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''تم خود کو دھوکا دے رہی ہو۔ وہ ایک مریض ہے۔ پتا نہیں کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیا تم اس کے ساتھ..........''

''معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ جب پتا چلا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ وہ تنہا ہے تو مجھے لگا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ میں نہیں سمجھ پاتی کہ یہ کیا ہے؟''

''یہ کچھ نہیں ہے۔ تم ایک نرم دل عورت ہو، اس پر ترس کھانے لگی ہو۔ تم جانتی ہو کہ اس نے اپنے اندر جوریز سٹینس پیدا کر لیا ہے اس کی وجہ تم ہو اور اب اگر وہ مرا تو تمہاری ہی وجہ سے مرے گا، اور تم یہ نہیں چاہتیں۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ اس کو بچانے کی کوشش میں تم ختم ہو رہی ہو۔''

مریم اٹھی، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کرمس کے درخت کے نیچے جا کر کھڑی ہوگئی اور سوچنے لگی کہ یہ درخت اپنی جڑیں گہرائی تک زمین میں اتارتے چلے جاتے ہیں اور خود

آسمان کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ان کا سفر دونوں سمتوں میں ہوتا ہے۔مگر مجھے ایک طرف، صرف ایک طرف بڑھنے کا فیصلہ کرنا ہے۔اس نے مڑ کر دیکھا، رابرٹ تھکا ہارا سا ایک بینچ پر بیٹھا دکھائی دیا۔دل بھر آیا، قدم خود بخود اس کی طرف بڑھنے لگے۔آسمان پر نگاہ کی۔بادل کے ایک سیاہ ٹکڑے نے چاند کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔چاروں طرف اندھیرا تھا، گہرا سناٹا تھا اور سناٹے میں بس ایک آواز گونج رہی تھی۔ ''اسے بچانے کوشش میں تم ختم ہو رہی ہو مریم ....تم ختم ہو رہی ہو۔''

''نہیں، میرا بچنا ضروری ہے۔اسے بچانے کے لیے بھی میرا بچنا ضروری ہے۔''

مریم کی رفتار میں تیزی آ گئی اور وہ چند لمحوں میں رابرٹ کے قریب جا پہنچی۔اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''چلو بہت دیر ہو گئی ہے۔''

رابرٹ نے بھی آہستہ سے مریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔مریم نے محسوس کیا کہ اتنی نرمی اور اتنی مضبوطی سے رابرٹ نے پہلی بار اس کا ہاتھ پکڑا ہے۔بیک وقت نرمی بھی اور سختی بھی۔ زندگی کے اس پہلو کی حقیقت اب اس پر رفتہ رفتہ کھل رہی تھی۔وہ رابرٹ کے قریب آ گئی اور دھیرے سے بولی۔

''رابرٹ یہ ہاتھ اسی طرح زندگی بھر تھامے رہنا۔''

''تم بھی وعدہ کرو، کبھی چھڑانے کی کوشش نہیں کرو گی۔''

''وعدہ کیا۔''

اب وہ دونوں زیادہ دیر سنجیدگی قائم نہیں رکھ سکے اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

سیاہ بادل کی اوٹ میں چاند کے چھپتے ہی بہت سے چھوٹے چھوٹے تارے اپنے وجود کا احساس کرانے لگے تھے۔تارے آسمان پر چمک رہے تھے لیکن ان دونوں کو لگ رہا تھا کہ ان کی راہ میں بکھرے پڑے ہیں، گویا وہ زمین پر نہیں، آسمان پر چل رہے ہوں۔اب وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سرکاری اسپتال کی طرف لوٹ رہے تھے۔چاہتے تو تھے کہ سفر کبھی ختم نہ ہو مگر تھوڑی ہی دیر میں اسپتال کے گیٹ پر جا پہنچے۔سیڑھیاں چڑھ کر وارڈ میں داخل ہوئے۔مریض سو چکے تھے، ڈیوٹی روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ اندر چلے گئے۔

میز پر اس مریض کی فائل کھلی پڑی تھی۔ کھڑکی سے آسمان پر چمکتا چاند صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بادل کا سیاہ ٹکڑا کہیں اور جا پہنچا تھا۔ مریم نے میز پر پڑی فائل کو اٹھالیا اور مختلف رپورٹوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ رابرٹ نے بھی اپنی کرسی اس کے قریب کھینچ لی۔ چند لمحوں بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھر یہ آہٹ بار بار ہونے لگی۔ باہر اندھیرا تھا۔ جھانک کر دیکھا ایک سایہ نظر آیا، انہیں محسوس ہوا کہ کوئی شخص دروازے تک آتا ہے، سامنے سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کے پاؤں کپکپاتے ہیں اور واپس لوٹ جاتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بہت دیر تک دیکھتے رہے۔ باہر وہی آنے اور لوٹ جانے کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک زوردار آواز ہوئی، کھڑکی سے ٹوٹ کر شیشے کے گرنے کی سی آواز۔ مریم اور رابرٹ گھبرا کر کیبن سے نکل آئے۔ مریم کے ہاتھ میں اس کی فائل تھی۔

''کیا ہوا؟ یہ کیسی آواز تھی.........کون ہے وہاں؟''

مریم کی آواز کانپ رہی تھی۔ وارڈ کے کچھ مریض بھی جاگ گئے، نرس آگئی۔ وارڈ میں سارے مریض موجود تھے، صرف وہ غائب تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ اور مریم نے بالکونی سے جھانک کر دیکھا، زمین پر ٹوٹے ہوئے شیشے بکھرے پڑے تھے اور جگہ جگہ خون کے نشان تھے۔

''مریم یہ خون کے نشان.........؟''

''ہاں رابرٹ وہ بالکونی سے کود کر بھاگا ہے، ننگے پاؤں۔''

''لیکن کیوں—؟''

''زینے کے راستے میں ہمارا کیبن تھا اور شاید اس کو پار کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اسی لیے.........''

''لیکن کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ بیچ میں علاج چھوڑ کر چلے جانا، موت کو بلانا ہے۔''

''جانتا تھا، اسی لیے چلا گیا۔''

مریم نے گہری سانس لی اور ایک بار پھر خون کے نشان دیکھنے کے لیے نیچے جھکی۔

''وہ دیکھو رابرٹ— کچھ دور جا کر یہ نشان غائب ہوگئے ہیں—''

رابرٹ نے مریم کا ہاتھ تھام لیا۔ مریم ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ''زخمی

پیروں پر مردہ کھال کے جوتوں کا خول چڑھا کر سمجھا ہوگا کہ شاید سفر کچھ آسان ہو جائے —"

مریم کیس ہسٹری کی فائل لیے بالکونی میں گم صم کھڑی تھی۔ رابرٹ نے مریم کے ہاتھ کو، جسے اس نے پہلے سے تھام رکھا تھا، مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مریم کی گرفت فائل پر ڈھیلی پڑنے لگی کہ ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ فائل کے کاغذ اڑے اور ایک ایک کر کے بالکونی کے نیچے پڑے خون سے سنے شیشے کی کرچوں کے ننگے بدن کو ڈھکنے لگے۔ مریم نے آہستہ سے رابرٹ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور واپس وارڈ میں آنے لگی — رابرٹ جو سمجھا تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس نے مریم کا ہاتھ تھام لیا ہے، تنہا بالکونی میں کھڑا رہ گیا۔

وارڈ میں پہنچ کر مریم نے دیکھا کہ وہ رومال جو اس نے کرسمس کے موقع پر اس مریض کو دیا تھا، بڑے سلیقے سے بستر پر رکھا ہوا ہے۔ وہ لمحے بھر کے لیے رکی اور پھر تیزی سے اپنے کیبن کی طرف چل پڑی —

○○○

لکیر

آج سورج غروب ہونے سے پہلے بادلوں بھرے آسمان پر عجب طرح کا رنگ چھا گیا تھا۔ یہ رنگ سرخ بھی تھا اور زرد بھی۔ ان دونوں رنگوں نے آسمان کو درمیان سے تقسیم کردیا تھا۔ جس مقام پر دونوں رنگ مل رہے تھے' وہاں ایک گہری لکیر دکھائی دیتی تھی۔ دھیان سے دیکھنے پر محسوس ہوتا کہ لکیر کے آس پاس کچھ سفید سائے ابھر رہے ہیں۔ سفید سایوں میں جب حرکت ہوتی تو یہ رنگ اور بھی گہرا ہونے لگتا اور پوری فضا پر خوف و ہراس طاری ہوجاتا۔ آج سے پہلے اس قصبے کے آسمان پر کبھی سفید سائے سرخ اور زرد رنگ بکھیرنے میں کامیاب نہیں ہوپائے تھے، مگر آج ....

اس خوفناک شام کی صبح ایسی نہیں تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ سویرے سے ہی بادل چھائے ہوئے تھے مگر ابھی تک ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کسی سائے نے نو اس

نہیں کیا تھا۔ سائے جو بظاہر سفید تھے مگر باطن میں سیاہی چھپائے پچھم کی جانب سے ابھر کر دھیرے دھیرے آکاش کے پوربی حصے پر پاؤں جمانے لگے تھے۔ سفید سایوں کے آکاش پر چھانے سے پہلے، بادلوں کے ٹکڑے آپس میں کھیلواڑ کرتے کرتے ایک دوسرے میں مدغم ہوجانے کی کوشش بالکل اس طرح کر رہے تھے جیسے بستی کے ہندو مسلمان، پنڈت برج کشور کے انتہائی جتن کے بعد، بھید بھاؤ کی لکیروں کو پھلانگ کر، ایک دوسرے میں سماتے جا رہے ہوں۔

بھادوں لگے سات دن گزر گئے ہیں، کل کرشنا اشٹمی ہے۔ لہٰذا شام ہی سے مندر کو سجایا جا رہا تھا۔ مندر کے بیچ والے کمرے میں چمکیلے رنگین کپڑوں میں لپٹے جھولے پر پڑے چھوٹے سے کھٹولے میں رکھی کرشن بھگوان کی مورتی کو بڑی عقیدت سے سجایا گیا تھا۔ رات بارہ بجے کرشن بھگوان کا جنم ہوگا، اس کی خبر علاقے کے ہندو مسلمان سبھی کو تھی۔ اس بار حمید بڑی بے چینی سے جنم اشٹمی کا انتظار کر رہا تھا۔ حمید، فقیر محمد کا لڑکا تھا اور مسجد کے مکتب سے بھاگ کر اپنے پڑوسی پنڈت برج کشور کی پاٹھ شالا میں پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ پنڈت برج کشور بھی اسے سبھی بچوں سے زیادہ پیار کرتے تھے اور کنہیا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنم اشٹمی کے انتظار میں اس کے اندر بہت سے خواب کرشن بن کر جنم لے رہے تھے اور وہ ان کو خیالوں کے ہنڈولے میں بٹھا کر جھولا جھلا رہا تھا۔

''نہیں حمید اتنے لمبے پینگ نہیں ....'' اس روز کُسم نے کہا تھا اور پھر حمید نے جھونٹے دینے بند کر دیے تھے۔ کُسم پنڈت برج کشور کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ نیم کی ڈال پر پڑے جھولے سے اتری تو حمید نے کرتے کے چاک کی جیب سے نبولیاں نکال کر اسے دے دیں۔ پکی نبولیاں کھانے کا اسے اتنا ہی شوق تھا جتنا حمید کو بانسری بجانے کا —— بانسری کی آواز سن کر پنڈت برج کشور نے گھوم کر دیکھا۔ کُسم پیتل کی گگری میں پانی بھر رہی تھی اور حمید آنکھیں بند کیے کنویں کے من پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ پنڈت جی مسکراتے ہوئے اٹھے اور کنویں کے پاٹ پر پہنچ کر حمید کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تو سچ مچ کنہیا ہے .... بالکل کنہیا۔ اب کے جنم اشٹمی پر تجھے ہی کرشن بنا کر ڈولے پر بٹھاؤں گا۔''

حمید کو لگا کہ وہ کرشن بن کر ڈولے پر بیٹھا مرلی بجا رہا ہے۔ ڈولے کے چاروں طرف

پنہارنیں، ماکھن والیاں اور جوگنیں گھیرا ڈالے کھڑی ہیں۔ اس کی نظریں بھیڑ کو چیرتی ہوئی کُسم کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ غور سے دیکھتا ہے، بہت سی عورتیں دوپٹے اوڑھے اور ریشمی غرارے پہنے جازم پر بیٹھی میلاد پڑھ رہی تھیں۔ کُسم امّاں جان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ کئی عورتیں جب ایک ساتھ میلاد پڑھتی ہیں تو ساتھ ساتھ کُسم کے ہونٹ بھی ہلتے نظر آتے ہیں۔ کُسم کے ہونٹ ہل رہے ہیں، حمید کے ہونٹوں پر مرلی دھری ہے۔ مُرلی بج رہی ہے یا کُسم میلاد پڑھ رہی ہے؟ معلوم نہیں ۔ہاں ایک شور ہے۔ اس کے اندر اس کے باہر۔ بچوں کا شور۔ شاید چھٹی ہوگئی ہے۔ بچے شور مچاتے اپنے اپنے گھر جا رہے ہیں' وہ چونکا اور پنڈت برج کشور کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ پنڈت جی مندر کے اس کمرے میں گئے جہاں کرشن بھگوان کی مورتی ہر وقت ہونٹوں پر مرلی دھرے رہتی ہے۔ حمید دروازے پر جا کر رک گیا اور مورتی کو گھورنے لگا۔ پنڈت جی نے جل چڑھایا آرتی اتاری اور پھر وہ آنکھیں بند کر کے پوجا کرنے لگے۔ حمید بھی پرارتھنا کر رہا تھا۔

''اللہ میاں جلدی سے جنم اشٹمی آئے اور میں مکٹ پہن کر کنہیا بنوں اور بانسری......''

اس کا داہنا پاؤں بائیں پیر کو پار کر کے پنجے کے بل ٹک گیا۔ جی چاہا کہ مورتی والی بانسری لے کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لے۔ اس کا دل بے چین تھا۔ کہیں سے گڑگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی۔ پھر اس نے ایک دن اوپر دیکھا تو آسمان پر بادل گرج رہے تھے۔ بارش کے آثار ہیں۔ آخر کنہیا جی کے لئے دھلنے ہیں، کل جنم اشٹمی ہے۔ حمید کی بے چینی دور ہوئی، آخر وہ دن آہی گیا جس کا اسے سال بھر سے انتظار تھا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کی نیند کرشن بھگوان کی مرلی کے سر بن کر بجنے لگی۔ مرلی بجتی رہی اور وہ کُسم کے سنگ رات بھر مندر کے احاطے میں جمنا کی لہروں کی طرح اچھلتا کودتا رہا۔ مندر کی عمارت اور پاٹھ شالا کے علاوہ احاطے میں ایک دالان بھی تھا، جس کی چھت بہت اونچی تھی۔ چار پہیوں کا رتھ نما ایک ڈولا جو لکڑی کا بنا تھا مگر پیتل کی نقشیں پتریں جڑی ہونے کی وجہ سے پیتل کا معلوم ہوتا تھا، اسی دالان کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ حمید کھیلتے کھیلتے ڈولے کے بیچوں بیچ بنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اسے لگا کہ یگ بیتتے جا رہے ہیں۔ وہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی انگلی پر ایک چکر ہے جو تیزی سے گھوم رہا ہے۔ اس کا وجود کائنات کے ذرّے ذرّے میں سماتا جا رہا ہے۔ آنکھیں کھلی ہیں۔ وہ سنسار کی ہر چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ سورج

کی شعاعوں کو، تاریک اور سیاہ راتوں کو۔ پھر دھیرے دھیرے رات اس کی آنکھوں میں اترنے لگی اور جب بیل گلے میں بندھے گھنگرو بجاتے کھیتوں کی جانب چل دیے اور مندر کے گھنٹے اور مسجد کے موذن نے صبح کا اعلان کر دیا تو حمید پنڈت برج کشور کی گود میں جا کر سو گیا۔ حمید کا رات بھر گھر سے غائب رہنا، دو دو تین تین دن تک غائب رہنا، فقیر محمد کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ رہس ہو، کرشن کتھا ہو یا راس لیلا، حمید گھر سے غائب۔ جنم اشٹمی پر بھی لوگ رات بھر مندر میں جمع رہتے، مندر کو سجایا سنوارا جاتا اور آدھی رات کو کرشن بھگوان کے جنم کی رسم ادا ہوتی۔ حمید بھی پچھلے کئی سال سے کُسم کے ساتھ کھیلتے کھیلتے مندر میں ہی رہ جایا کرتا۔

رات کے دوسرے پہر کی رخصت اور تیسرے پہر کی آمد کا اعلان پنڈت برج کشور نے شنکھ بجا کر کیا۔ تھال میں سجا پرساد بھگوان کی مورتی کے سامنے رکھا تھا۔ پنڈت جی نے دیکھا کہ چاند آسمان پر پاؤں جما چکا ہے۔ کبھی کبھی بادلوں کے ٹکڑے گھونگھٹ بن کر چاند کے چہرے کو چھپا لیتے ہیں۔ چاند نکلنے کی کوشش کرتا ہے پھر چھپ جاتا ہے گویا ننھے کشن گوپیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ مندر میں جمع لوگ کیرتن ختم کر کے برت کھولنے کے لیے جل سے بھرے پیتل کے لوٹے میں لونگ، بتاشے اور پھول ڈالتے ہیں اور پھر چاند کی طرف رخ کر کے دھرتی پر جل گراتے ہیں۔ جل دھرتی پر گر رہا ہوتا ہے لیکن ان کی شردھا سوکھے اور بنجر چاند کو سینچ رہی ہوتی ہے۔ حمید سب سے پہلے پرساد لینے کی کوشش میں بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ پنڈت جی اس کے چہرے پر چاند کی سی چمک دیکھتے ہیں اور اس کے ہاتھ پر پرساد رکھ دیتے ہیں۔ کسم اس کے برابر کھڑی ہے۔ وہ کُسم کو اپنے حصے کا پرساد دے دیتا ہے اور وہ مٹھی بند کر کے آنکھیں موند لیتی ہے۔

'اماں جان نے بڑے پیار سے کسم کو میلاد کا تبرک دیا ہے۔ کسم دونوں ہاتھوں میں تبرک لیے آنکھیں موندے کھڑی ہے۔ حمید بھی اس کے برابر کھڑا ہے۔'

"کھاؤ کُسم، پرساد کھاؤ۔ کنہیا جی کے جنم کا پرساد ہے۔"

وہ آنکھیں کھول کر حمید کی طرف دیکھتی ہے۔ حمید پھر کہتا ہے۔

"کھاؤ۔ جانتی ہو کل کیا ہوگا۔"

"ہاں ——" وہ کہتی ہے۔ "کنہیا جی کے ڈولے کا گشت ہوگا۔"

"کُسم پتا ہے اس بار ڈولے پر کرشن بن کر کون بیٹھے گا؟"

وہ حمید کی آنکھوں میں جھانکتی ہے اور جانے کیا سوچ کر ہنس پڑتی ہے ــــ کُسم کی ہنسی فضا میں تیرنے لگتی ہے اور پھر اس کے ننھے مُنے جگنو سے چمکتے قہقہے آسمان پر تارے بن کر ٹنک جاتے ہیں۔ بادلوں سے جھانکتے تارے دھیرے دھیرے اپنا وجود کھونے لگتے ہیں۔ صبح ہو جاتی ہے اور پھر حمید دیکھتا ہے کہ مندر کے احاطے میں قصبے کے بخشی جی، سیٹھ ڈونگرمل، وید جی اور دوسرے ذمہ دار لوگ جمع ہیں۔ پنڈت جی ان کے درمیان گھرے بیٹھے ہیں۔ بخشی جی پوچھتے ہیں۔

''ہاں تو پنڈت جی کس بچے کو چُنا ہے؟''

پنڈت برج کشور کی آنکھوں میں حمید کا سانولا چہرہ اور اس کی معصوم شرارتیں رقص کرنے لگتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''کنہیا ہی کرشن بنے گا۔''

لوگ تعجب سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگتے ہیں اور وید جی کے منہ سے نکلتا ہے:

''کیا؟ کنہیا؟''

پنڈت جی چونک پڑتے ہیں: ''میرا مطلب ہے حمید ــــ''

''حمید! ــــ'' بیک وقت کئی لوگوں کے منہ سے نکلتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا جاتی ہے۔ یہ لمحہ صدیوں پر پھیل جاتا ہے۔ پھر ایک آواز اٹھتی ہے اور خاموشی ٹوٹ جاتی ہے۔

''لیکن لڑکا ہندو ہی ہونا چاہیے ــــ''

پنڈت برج کشور کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بخشی جی بول پڑے۔

''پنڈت جی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جنم اشٹمی پر کرشن کسی مسلمان بچے کو بنایا گیا ہو ــــ'' سیٹھ ڈونگرمل نے بھی کھنکارتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے پنڈت جی کہ ہمیں بھید بھاؤ مٹا دینے چاہئیں مگر............''

''مگر کیا سیٹھ جی؟'' پنڈت برج کشور بولے۔ ''پچھلے برس کا ناٹک آپ تو بھول گئے۔ کرشن کا پارٹ کرنے پر ڈپٹی صاحب نے اسے انعام دیا تھا ــــ''

'' ناٹک کی بات اور ہے پنڈت جی ــــ'' سیٹھ ڈونگرمل کی کرخت آواز نے

پنڈت جی کے ذہن کو جھنجوڑ دیا، مگر انہوں نے اپنی بات اس طرح جاری رکھی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ بولے : ''اور پھر دسہرے پر جو رام لیلا منڈلی آئی تھی اس میں جس نے رام کا پارٹ کھیلا تھا وہ بھی تو مسلمان ہی تھا۔ کیا تم سب نے اس کی آرتی نہیں اتاری تھی۔ کیا راج تلک والے دن سب نے اس کے چرن نہیں چھوئے تھے۔ کیا اس سمے تم نے اسے رام نہیں مانا تھا۔ ارے سیٹھ جی ہمارا دھرم تو کہتا ہے کہ چاہے پتھر ہو، چاہے مٹی۔ اب وہ جس روپ میں ہے وہی اس کا اصلی روپ ہے۔ حمید تو ابھی بالک ہے اور بالک پوتر ہوتا ہے۔ پھر کیوں اسے کرشن نہیں بنا سکتے۔ وہ تو کنہیا ہے.................. بالکل کنہیا ——'' وہ پل بھر کو رکے، مستک پر پریم اور بھگتی کی لہریں ابھرنے لگیں، پھر منہ سے لاڈ بھرے یہ شبد نکل پڑے :

''وہ تو کنہیا ہے، ہمرا کنہیا ——''

کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے پنڈت جی۔ اگر آپ نہیں مانے تو ڈولا نہیں نکل پائے گا۔ ہم دیکھ لیں گے۔''

اور اسی وقت پنڈت برج کشور نے آسمان کی طرف دیکھا۔ کئی سفید سائے آکاش سے اتر کر بھیڑ میں شامل ہوتے نظر آرہے تھے۔

''پنڈت جی سب آپ کا سمان کرتے ہیں لیکن.................''

''لیکن حمید کرشن نہیں بنے گا۔ یہی نا.................؟'' اس دفعہ پنڈت جی کا لہجہ سخت تھا۔ لیکن وہ فوراً ہی نرم ہو گئے اور بہت دیر تک لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر کافی تکرار کے بعد انتخاب تو حمید کا ہی ہوا مگر کچھ لوگ مندر کے احاطے سے نکل کر چلے گئے۔

پنڈت جی نے دوپہر سے ہی حمید کو نہلا دھلا کر کرشن کے روپ میں سجانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے پورے بدن پر ہلکا ہلکا نیل پوتا۔ مردار سنگ کو بھگو کر سل پر گھسا، پھر حمید کے چہرے پر اس کا لیپ کر دیا۔ چہرہ خشک ہونے لگا تو گلابی اور نیلا رنگ ملا کر رخساروں پر لگا دیا۔ کمر میں کاچھنی، گلے میں بیجنتی مال، سر پر کارچوبی مکٹ، ہاتھ میں بنسی اور گردن کی بائیں جانب سے کمر کے داہنے حصے تک ایک چمکیلی چندری باندھ کر پنڈت جی نے اپنے کنہیا کو سچ مچ کا کرشن بھگوان بنا دیا۔ کرشن بھگوان نے ہونٹوں پر چاندی کی وہ مرلی رکھ لی جس میں چھ راگ چھتیس راگنیاں بجتی تھیں۔ پنڈت جی ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھک گئے۔

"آو پیارے موہنا پلک ڈھانپ تو بے لیوں"........."آؤ..........."

اور پھر پیتل کی تھالی میں گھی کا دِیا' پھول' بتاشے' چاول اور پسی ہوئی گیلی ہلدی رکھ کر کرشن بھگوان کی آرتی اتاری گئی۔ ماتھے پر ہلدی کا تلک لگا کر چاول کے دانے چپکا دیے اور کرشن بھگوان کو ڈولے کے بیچوں بیچ بنی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ یگ بیتنے لگے، شریر بڑھنے لگا، انگلی پر ایک چکر تھا جو تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اب کرشن بھگوان کا وجود کائنات کے ذرے ذرے میں سماتا جا رہا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ سنسار کی ہر چیز کو دیکھ سکتے تھے۔ سورج کی شعاعوں کو تاریک اور سیاہ راتوں کو ــــ

رتھ کے پہیے گھومے، آگے باجا پیچھے کیرتن منڈلی اور چرنوں میں آرتی کی تھالی لیے پنڈت برج کشور ــــ گشت شروع ہوا۔ شردھالو آرتی اتارتے، چڑھاوا چڑھاتے اور بھگوان کے پیر چھو کر ڈولے سے اتر جاتے۔ ڈولا جب گلیوں اور چوپالوں سے گشت کرتے ہوئے مسجد کے قریب پہنچا تو آسمان پر سورج بھی اپنا گشت پورا کر چکا تھا اور موذن مغرب کی اذان دینے کے لیے سقاوے پر کھڑا ڈولے کے گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ یاترا مسجد کے برابر آکر ٹھہر گئی۔ کیرتن منڈلی بلند آواز میں کیرتن گا رہی تھی۔ بھگوان کے آگے دوزانو بیٹھ کر کسی نے آرتی گائی۔

"جے شری کرشن ہرے، پربھو جے شری کرشن ہرے
بھگتن کے دکھ سارے پل میں دور کرے
جے شری کرشن ہرے پربھو جے شری کرشن ہرے......"

اور پھر اس نے پوری طاقت سے شنکھ بجا دیا۔ شنکھ کی آواز سن کر باجے والوں نے بھی باجے کی آوازیں تیز کر دیں۔ ان آوازوں کی کوکھ سے ایک بہت بھیانک آواز اس وقت اٹھی جب مسجد کی طرف سے آئے اینٹ کے ایک بڑے ٹکڑے نے کرشن بھگوان کے ماتھے پر خون کی لکیر کھینچ دی۔ بھگوان کے ماتھے سے جب خون کی بوند گری تو آرتی کے تھال میں جلتا دیا بجھ گیا۔ اینٹ کرشن بھگوان کے ماری گئی تھی، چوٹ حمید کے لگی تھی اور آرتی کا دِیا بجھ گیا تھا موہنے کنہیا کے خون کی بوند سے ــــ چاروں سمت بے ہنگم شور برپا ہوا۔ چیخ پکار توڑ پھوڑ اور جذبات سے بھری آوازوں نے مسلمانوں کے دروازوں کو گھیر لیا۔ مسجد کے دروازے پر بھی

لوگ جمع ہونے لگے۔ پنڈت برج کشور بھیڑ کو چیرتے ہوئے دروازے تک پہنچے تو دیکھا ایک نوجوان مسجد کے دروازے کو کلہاڑی سے گودے چلا جا رہا ہے۔ پنڈت جی نے اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھین لی۔ پھر ایک سمت سے ''نعرہ تکبیر اللہ اکبر'' کی آوازیں آئیں۔ پنڈت جی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ سیٹھ ڈونگر مل اور رامانندی لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''بھیا یہ کیا؟ یہ کیا بھیا۔ ہم سب...... ہم سب بھائی ہیں۔ اسی دھرتی پر پیدا ہوئے ہیں اور اسی............'' پیچھے سے آواز آئی۔ ''ہاں اور اسی دھرتی پر مریں گے بھی۔'' اور اسی وقت سیٹھ ڈونگر مل اور رامانندی ہلاک کر دیے گئے۔ دونوں کے قتل کے بعد شور اور تیز ہو گیا تو پنڈت جی کلہاڑی پھینک کر بندا خاں کے دروازے کی طرف بھاگے، جہاں سے ''جے بجرنگ بلی'' کا نعرہ بلند ہوا تھا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو دروازہ شعلے اگل رہا تھا اور اندر عورتوں اور بچوں کی آوازیں بلک رہی تھیں ——

پنڈت جی نے دیکھا کہ ہر شخص کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کے سائے لرز رہے ہیں۔ ہر شخص کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان تھا۔ ''یہ کیسے ہو گیا؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' مگر پھر بھی سب کچھ ہو رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب کچھ ہو رہا تھا۔ آخر کیسے؟ وہ کون سی طاقت ہے جو نظر نہ آتے ہوئے بھی سب کچھ............اور اسی وقت پنڈت جی نے دیکھا کہ کچھ لوگ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آسمان جو سب کے سروں پر تھا، اس آسمان پر عجب طرح کا رنگ چھا گیا تھا۔ یہ رنگ سرخ بھی تھا اور زرد بھی۔ جس مقام پر دونوں رنگ مل رہے تھے وہاں ایک گہری لکیر دکھائی دیتی تھی۔ دھیان سے دیکھنے پر محسوس ہوتا کہ لکیر کے آس پاس باطن میں سیاہی چھپائے سفید سائے ابھر رہے ہیں اور پوری فضا پر خوف و ہراس طاری ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے قصبے کے آسمان پر سفید سائے کبھی سرخ اور زرد رنگ بکھیرنے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے مگر آج ...... مگر آج ان سایوں کو دیکھ کر کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ بڑے بڑے گرز لیے ہماری مدد کو تیار ہیں تو کچھ ان کے ہاتھوں میں ننگی شمشیریں دیکھ کر اپنے اندر بے پناہ قوت محسوس کر رہے تھے کہ اچانک یہ سائے آسمان سے اتر کر بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ پنڈت برج کشور کی نظر ڈولے پر پڑی تو وہ لرز گئے اور بے تحاشا ڈولے کی طرف بھاگنے لگے۔

پنڈت جی نے دیکھا کہ ایک شخص نے ڈولے پر رکھا پھرسا اٹھالیا ہے اور کرشن بھگوان اس کے آگے ہاتھ جوڑے ڈرے سہمے کھڑے ہیں۔ تیز دھاروالا یہ پھرسا ہر سال ڈولے پر رکھا جاتا ہے اور گشت پورا ہونے پر کرشن بھگوان اسی پھرسے سے کنس کا ودھ کرتے ہیں۔

پنڈت برج کشور کے منہ سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔ ''یہ کیا...... یہ تو کرشن بھگوان ہیں...... کنہیا...... ہمرے کنہیا —— '' ہر پرساد جس نے ابھی ابھی آرتی گائی تھی، بھرائی ہوئی آواز میں مسمسا اٹھا۔ ''ناہیں...... یہ حمید ہے۔ فقیر محمد کا لڑکا۔'' ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں —— ''ہاں یہ حمید ہے، ایک مسلمان کا لڑکا۔ ہمارے کرشن بھگوان کا اپمان کیا ہے انہوں نے۔ ڈولے پر اینٹ پھینکی ......بھگوان کے ماتھے سے خون بہا۔ اور اب دروازے بند کرکے گھروں میں چھپ گئے ہیں۔'' ڈولے پر کھڑا شخص پھرسا ہوا میں اٹھاتے ہوئے دہاڑا —— ''ہم اس کا بدلہ لیں گے۔ ہم آج اسے..........''

''نہیں۔'' پنڈت برج کشور چیخے اور اس کے ہاتھ سے پھرسا چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر اس شخص نے پنڈت جی کو زور سے دھکا دے کر ڈولے سے نیچے ڈھکیل دیا اور پھر حمید کے سر پر پھرسے کا ایک بھرپور وار کر دیا۔

مکٹ، کاچھنی اور بیجنتی مال پہنے کرشن بھگوان ڈولے سے نیچے لڑھک پڑے اور دھرتی پر خون کی ایک لکیر بہت دور تک کھنچتی چلی گئی —— کچھ لوگ لکیر کے اِدھر تھے اور کچھ اُدھر۔ دونوں طرف شور تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ لکیر کے اِدھر زیادہ شور ہے یا اُدھر ——!!

○○○

آدھی سیڑھیاں

سعیدہ بیگم اپنے کمرے سے نکل کر دہرے دالان سے ہوتے ہوئے احمد کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''اٹھ گئے بیٹے ؟''

''جی امی جان ــــــ''

احمد آنکھیں ملتا ہوا بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

''آفتابے میں گرم پانی رکھ دیا ہے، جاؤ منہ دھو لو۔''

احمد نے منہ دھو لیا تو سعیدہ بیگم ناشتہ لے کر اس کے کمرے میں آ گئیں۔

''اب شادی میں صرف ایک مہینہ باقی ہے اور تم نے روپیوں کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا۔ مہمانوں کو دعوت نامے بھی پہنچنے ہیں۔ ایک مہینہ پہلے سے

تو مہمان داری جڑنا ہی چاہیے۔''

احمد روغنی روٹی کا نوالہ چباتے ہوئے بولا۔

''امی جان، اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو مہینوں پہلے سے شرکت کرے۔ جنہیں بلانا ہوگا ہفتہ بھر پہلے دعوت نامے بھیج دیں گے۔ خاص خاص رشتے داروں کو تو بلانا ہی ہے۔ بھیڑ جمع کرنے سے کیا فائدہ۔''

سعیدہ بیگم نے دیکھا کہ رکابی میں خاگینہ اسی طرح رکھا ہوا ہے اور وہ روکھے لقمے نگل رہا ہے۔

''ٹھیک ہے بیٹے جیسی تمہاری مرضی۔''

احمد نے ناشتے کے بعد سلفچی میں ہاتھ دھوئے اور صدر دروازے سے نکلتا ہوا لالا دیوی سرن کی بیٹھک کی جانب مڑ گیا۔ لالا چبوترے پر ہی دھوپ میں پلنگ ڈالے بیٹھے تھے۔

''آؤ احمد میاں .... کیسے تکلیف کی؟''

احمد چارپائی کے برابر رکھے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

''بہت دنوں سے آپ کے درشن نہیں ہوئے تھے۔ پڑھائی لکھائی کے چکر میں علی گڑھ سے آنا ہی نہیں ہوتا۔ سوچا اب آیا ہوں تو آپ سے مل آؤں اور پھر نیوتا جو دینا تھا۔''

''کاہے کا نیوتا احمد میاں ——''

لالا جی کا ہاتھ پیٹ پر رینگنے لگا۔

''وہ بات یہ ہے کہ میں نے .... میرا مطلب ہے امی جان نے رشتہ پکا کر دیا ہے۔ ایک مہینے بعد کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔''

''مگر رشتہ تو میاں اپنے سامنے ہی پکا کر گئے تھے۔ روشن نگر والے میاں کی بیٹی کے ساتھ۔''

''وہ بات یہ ہے کہ..........''

احمد سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''اچھا تو وہاں سے رشتہ ٹوٹ گیا ——''

لالا دیوی سرن نے ٹوٹنے پر اس طرح زور دیا جیسے یہ تو ٹوٹنا ہی تھا۔

''ویسے اب کہاں ہوا ہے رشتہ؟''

احمد کا جی چاہا کہ کوئی جواب نہ دے مگر اس نے الفاظ ڈھکیلے۔

''علی گڑھ میں ہی ایک لڑکی ہے۔''

''تمہارے سنگ پڑھتی ہوگی۔''

''جی۔''

مجرم کی طرح احمد نے گردن جھکالی۔

''احمد میاں جب سے تم علی گڑھ گئے ہو، تمہارا بستی سے کوئی ناتا ہی نہیں رہا۔ کتنی پڑھائی اور ہے؟''

''بس ریسرچ .... یعنی کچھ لکھنا ہے بس ایک کتاب۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں .... تم نے کھیتی باڑی بھی نوکروں کے اوپر چھوڑ رکھی ہے اور اب تو شادی بھی علی گڑھ میں ہی ....''

وہ سر نیچا کیے خاموش بیٹھا تھا۔

''بیاہ کی تیاری تو سب ہے نا؟''

''ہاں تیاری تو ہو رہی ہے۔''

احمد نے آہستہ سے کہا۔ لالا دیوی سرن نے گھاگ نظروں سے اسے دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئے۔

اچھا تم کل صبح نو بجے آجانا۔''

صبح اٹھ کر جب وہ ڈیوڑھی کے صدر دروازے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دو بچے دھوپ میں کنچے کھیل رہے ہیں۔ احمد اونچے چبوترے پر کھڑا چھوٹی چھوٹی کانچ کی ان گولیوں کو دیکھتا رہا جنہیں بچے انگلیوں سے ادھر اُدھر لڑھکا رہے تھے۔ ہری گولیوں والا بچہ جیت رہا تھا۔ بچے نے جیب سے ہری گولیاں نکال کر اطمینان سے زمین پر پھیلا دیں اور جیتی ہوئی لال گولیوں کو چاک کی جیب میں رکھ لیا۔ احمد نے سامنے دیکھا، دور تالاب کے اس پار اس کے اپنے ہرے

ہرے کھیت لہلہا رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جب کھولیں تو محسوس ہوا کہ صدیاں بیت گئی ہیں۔ اب بازی پلٹ گئی تھی۔ زمین پر بکھری ہری گولیاں غائب تھیں اور لال گولیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ سورج کی کرنیں زمین پر اتر آئی تھیں اور کانچ کی لال گولیوں پر اس طرح پڑ رہی تھیں کہ اس کے کھیت اب سرخ نظر آ رہے تھے۔ احمد نے گھڑی دیکھی، نو بجنے ہی والے تھے۔ وہ لالا دیوی سرن کی گدی پر پہنچا تو دیکھا کہ لالا اپنا لال بہی کھاتا لیے کچھ لوگوں کے بیچ بیٹھے حساب کتاب میں مشغول ہیں۔

"آداب عرض لالا جی ——"

"آداب عرض احمد میاں۔ کیسے آنا ہوا؟"

"جی ——؟"

احمد بوکھلا گیا۔

"ارے ہاں .... آؤ آؤ بیٹھو۔ اچھا کندن لال جی کل آنا کام ہوجائے گا اور بھیا نندنا تم بھی اپنے گاؤں جاؤ فکر مت کرو اور تم یہ لو......"

سب لوگ لالا جی کو نمستے کرتے ہوئے بیٹھک سے اٹھ کر چلے گئے اور جو بیٹھے رہ گئے وہ جیسے آدمی نہ ہوں سامان کی گٹھریاں رکھی ہوں —— لالا دیوی سرن نے احمد کی طرف کھسکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہیں روپیوں کی ضرورت ہے نا؟"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ دراصل لالا دیوی سرن کا سوال ہی احمد کا جواب تھا۔

"دیکھو کنور صاحب، سرکار نے کچھ ایسے قانون بنا دیے ہیں کہ بغیر کوئی چیز رکھے بیاج پر روپیہ دیتے ڈر لگتا ہے۔ اب تو بیاج کا کام ختم ہوتا ہی لگے ہے۔ پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ سوچ رہا ہوں بھینسیں پال کر دودھ کا کام شروع کردوں۔"

لالا دیوی سرن بولتے رہے۔

"شادی کے بعد ماتا جی کو تو اپنے ساتھ ہی لے جاؤ گے، ڈیوڑھی خالی ہوجائے گی، زنان خانہ تو ٹوٹ ہی گیا ہے بس ڈیوڑھی کا حصہ بچا ہے، اگر تم اسے بیچ دو تو میں اس میں بھینسیں پالنے کا بندوبست کرلوں۔ میرا بھی کام نکل جائے گا اور تمہاری شادی بھی ...."

احمد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کچھ حیرت سے، کچھ قصداً تا کہ آنسو خشک ہو جائیں اور ٹپکنے نہ پائیں۔ رنگ برنگے دائرے بننے مٹنے لگے اور نظروں میں بچپن کی دھندلی تصویریں ابھر آئیں۔

'ابا حضور دالان میں بیٹھے فرشی حقہ پی رہے ہیں۔ دھوئیں میں شامل خمیرے کی خوشبو سے فضا معطر ہے۔ وہ امی جان کے ہاتھ کی کڑھی سچے گوٹے کی کناری والی گول ریشمی ٹوپی پہنے آنگن میں کھیل رہا ہے۔ دھوپ میں جہازی پلنگوں پر ابا حضور کی اچکنیں، گرم شیروانیاں اور امی جان کے کمخواب اور پوتھ کے غرارے پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے پشمینے کی شالوں اور کشمیری نمدوں میں بسی کافور کی مہک بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ ابا حضور کی آنکھ بچا کر کپڑوں سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ ریاضو گود میں اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بری طرح مچلنے لگتا ہے۔ پائیں باغ میں رحیما بیلے اور ہارسنگار کے پھول چن رہا ہے۔ امی جان ہاتھ میں آب پاش لیے شہتوت کے پیڑ میں پانی لگا رہی ہیں۔ یہ پیڑ دادا جان نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس کے شہتوت بہت میٹھے ہیں۔ جب بھی اترتے ہیں تو امی جان غفور خاں کے ہاتھ روشن نگر ضرور بھیجتی ہیں۔'

"کیا سوچ رہے ہو احمد میاں؟"

لالا دیوی سرن نے اسے چونکا دیا۔

"لالا جی، میں ڈیوڑھی تو نہیں بیچ سکتا۔"

احمد نے دوٹوک جواب دیا اور سوچنے لگا کہ ایک تو پہلے ہی بہت کچھ بک چکا ہے۔ ڈیوڑھی کے علاوہ بمبے کے سہارے والی اسی بچاسی بیگھے زمین ہی تو بچی ہے۔ اگر ڈیوڑھی بھی بک گئی تو بستی میں جو کچھ عزت ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی۔ پھر لالا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آپ اگر سود پر روپیہ نہیں دے سکتے تو دس پانچ بیگھے زمین خرید لیجیے۔

"نہیں احمد ——"

میاں شاید دل میں کہا ہو مگر زبان سے صرف احمد ہی نکلا اور احمد کے بعد تھوڑا وقفہ دیا پھر بولے۔

"میرے پرکھوں نے بھی کھیتی نہیں کی۔ میں زمین کا کیا کروں گا اور وہ بھی صرف دس پانچ بیگھے۔اب اتنی سی زمین کے لیے نوکر رکھوں، جوار ابناؤں اور پھر بیل باندھنے کو ایک گھیر .... ایک دو بیگھے زمین تو اسی میں گھر جائے گی، پھر بچی ہی کتنی —"

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے پھر لالا دیوی سرن کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"ہاں اگر سوڈیڑھ سو بیگھے زمین ہوتو اس میں کچھ روپیہ لگا یا بھی جائے۔ مجھے زمین کا بیوپار تو کرنا نہیں ہے کہ تم سے اونے پونے داموں میں خرید کر کسی اور کو بیچ دوں۔"

"لالا جی امی جان نے آپ ہی کے بھروسے تاریخ طے کی تھی —"

"تو پھر ساری زمین بیچ دو۔ میں خرید لوں گا۔ تمہیں کون سی کھیتی باڑی کرنی ہے۔ پڑھ لکھ کر تو نوکری ہی کرو گے۔"

لالا دیوی سرن احمد کا چہرہ پڑھنے لگے۔ پھر خاموش بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا اور الماری سے پوتھی نکال کر پٹ اس طرح بند کیے جیسے احمد کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا ہو۔ احمد نے محسوس کیا کہ وہ سامان کی گٹھری بن گیا ہے۔

اس نے پہلو بدلا تو لالا نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور بولے۔

"یا پھر کسی کسان سے بات کرلو۔ کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔

احمد کہاں گھر گھر جا کر زمین بیچنے کی بات کرتا گھومتا۔ اس نے دو چار لوگوں سے بات کی بھی مگر ان کے لیے اتنی جلدی روپیوں کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ جن کے پاس روپے تھے وہ اس کی ضرورت کا فائدہ اٹھا کر کوڑیوں کے دام خریدنا چاہتے تھے۔ شادی کے دن قریب آتے جارہے تھے اور ابھی تک پاندان کی چھالیوں بھر کا انتظام بھی نہ ہو پایا تھا۔ بدنامی کے خوف سے تاریخ بھی نہیں بڑھائی جاسکتی تھی۔

مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ بمبے والے کھیت اندھیرے میں ڈوب گئے تھے، مگر وہ ڈیوڑھی کی بالائی منزل پر کھڑا اپنے کھیتوں کو گھورے جارہا تھا۔ زینے سے اتر کر جب اس نے سعیدہ بیگم کے کمرے میں جھانکا تو وہ دعا کے بعد جانماز لپیٹ رہی تھیں۔ جب وہ پلنگ پر تسبیح لے کر بیٹھیں تو احمد بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ سعیدہ بیگم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

''وہ ایسا ہے امی جان ——''

''کیا ہے بیٹے؟''

''کچھ نہیں، آج سردی بہت ہے۔''

''کیا بتو کی اماں نے تمہارے پلنگ کے نیچے بھوبھل کا کونڈا نہیں رکھا؟''

انہوں نے کچھ اس انداز سے باہر جھانکا جیسے بتو کی اماں کو پکارنے والی ہوں۔

''بھوبھل تو رکھ دی ہے مگر سوچا کچھ دیر آپ کے پاس ہی بیٹھ لوں۔''

''ہاں بیٹے .... تمہارا یہاں دل بھی تو نہیں لگتا ہوگا۔ بچپن میں ہی تو شہر چلے گئے تھے۔ کبھی ایک دو روز کے لیے آتے ہو، دل لگے بھی کیسے۔''

''نہیں امی جان یہ بات نہیں ہے، دراصل آپ سے ایک بات کرنی تھی۔''

''ہاں ہاں کہو ....''

سعیدہ بیگم نے تسبیح تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''بات تو کوئی خاص نہیں ہے۔ بس یوں ہی اپنے فیوچر .... میرا مطلب ہے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پڑھائی سال ڈیڑھ سال میں ختم ہو جائے گی۔ آج کل نوکریاں تو ملتی نہیں ہیں اور پڑھائی لکھائی کے بعد یہاں آکر کھیتی باڑی کرنا ...... کھیتی باڑی بھی کوئی کیا کرے، حکومت نے سیلنگ کا ایسا چکر چلایا ہے کہ پتا نہیں یہ زمین بھی رہے یا نہیں۔ میں نے سوچا ہے ....''

احمد کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا سوچا ہے؟''

سعیدہ بیگم نے پوچھا۔

ہمیں اب کھیتی کے بھروسے نہیں رہنا چاہیے۔ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ ......''

''بات تو ٹھیک ہے، مگر اور کیا ہو سکتا ہے؟''

سعیدہ بیگم غور سے سننے کے لیے تھوڑا آگے کھسک آئیں۔

''آج کل شہروں میں مکانوں کے کرائے بہت ہیں، اگر کچھ مکان بنوا دیے جائیں تو ماہانہ آمدنی خاصی ہو جائے گی۔ اور پھر رہنے کو بھی ایک مکان ہو جائے گا، کرائے

کے مکان میں تو...... آپ کا بھی یہاں اکیلے دل گھبراتا ہوگا، وہیں ساتھ رہیں گے۔ آپ کا دل بھی لگا رہے گا۔"

احمد ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو سعید بیگم نے چھت کی طرف دیکھا۔ ایک جنگلی کبوتر شہتیر کے کنڈے میں جھول رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اپنے پر پھلانے لگا اور پھر کنڈے کے دائرے سے نکل کر پر پھڑ پھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ نیچے فرش پر گرنے ہی والا تھا کہ سنبھلا اور روشن دان کی طرف اڑا۔ روشن دان کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا، کبوتر تیزی سے نکلا اور باہر تاریکی میں گم ہو گیا۔ سعیدہ بیگم نے احمد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"لیکن بیٹے، اس کے لیے پیسا بھی تو چاہیے۔"

"امی جان نوکروں کی کھیتی میں بچتا ہی کیا ہے۔ اور اس وقت لالا دیوی سرن ہماری زمین کے دام بھی اچھے لگا رہے ہیں۔ آئندہ معلوم نہیں کیسا موقع ہو، اگر آپ کی اجازت ہو............"

سعیدہ بیگم کی آنکھ سے آنسو گرا اور لحاف کی روئی میں جذب ہو گیا۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولیں

"اس بچی کھچی زمین کو کیوں بیچتے ہو۔ تمہارا یہاں سے بالکل اکھڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے کبھی کبھار آ بھی جاتے ہو۔ پڑی رہنے دو اسے اپنے ابا حضور کی نشانی سمجھ کر۔"

"لیکن امی جان، شادی کے لیے روپیوں کا انتظام بھی تو نہیں ہو پایا ہے۔ لالا نے سود پر دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ میں نے چاہا دس پانچ بیگھے زمین بیچ دوں مگر کوئی گاہک نہیں ملا۔ لالا تیار ہیں مگر کہتے ہیں، ساری زمین بیچو تو خرید بھی لوں ——"

"کوئی اور صورت نکل سکتی ہو تو اچھا ہے بیٹے۔"

"بس ایک ہی طریقہ ہے کہ چار پانچ معمولی سے جوڑے ہو جائیں اور ابا حضور کے جو بٹن ہیں........"

سعیدہ بیگم نے جلدی سے احمد کی بات کاٹ دی۔

"نہیں احمد، ہمیں برات لے کر دوسرے کی دہلیز پر جانا ہے۔ اپنی نہیں تو اپنے ابا حضور کی عزت کا تو خیال کرو، اگر شادی دھوم دھام سے نہیں ہوئی تو بستی والے کیا کہیں گے۔"

"مگر اب روپیوں کا تو کہیں سے انتظام نہیں ہو سکتا۔"

"کچھ بھی ہو بیٹے، زمین بیچنا ٹھیک نہیں ہے۔"

سعیدہ بیگم نے لیٹتے ہوئے کہا۔

احمد اپنے کمرے میں جلتی ہوئی لالٹین کی لَو کبھی تیز کرتا تو کبھی کم۔ جب لو اتنی کم ہو جاتی کہ لالٹین کے بجھ جانے کا گمان ہونے لگتا تو وہ ہڑبڑا کر اس کی لو اتنی تیز کر دیتا کہ چمنی چٹخ جانے کا خوف اس کے جسم میں تیر جاتا۔ چمنی اتنی سیاہ ہو چکی تھی کہ شیشے کی قید سے باہر نکلنا اب روشنی کے بس میں نہیں تھا۔

"آنکھیں بند کر لینا اور سو جانا ہی بہتر ہے۔" اس نے سوچا۔

وہ بستر پر لیٹ تو گیا مگر نیند لالا دیوی سرن کی چوکھٹ پر کھڑی رہی اور اس کی آنکھیں رات بھر چھت کی کڑیاں گنتی رہیں۔

سعیدہ بیگم کو کچھ بتائے بغیر سب طے ہو گیا۔ لالا دیوی سرن نے آدھی رقم دے کر کاغذ کرالیا اور باقی روپے بیع نامے کے وقت دینے کا وعدہ کر لیا۔ احمد نے جب سعیدہ بیگم کے ہاتھ میں روپے لا کر دیے تو ان کے ہاتھ کانپ گئے۔ احمد کے چہرے کا جائزہ لیا، پھر بولیں۔

"کیا تم نے زمین بیچ دی ——؟"

"اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"تو کیا یہ ڈیوڑھی بھی بیچ دو گے؟"

سعیدہ بیگم کی بوڑھی نظریں ڈیوڑھی کی دیواروں پر رینگنے لگیں۔

"نہیں امی جان، عید بقرعید تو ہم یہیں کیا کریں گے۔"

احمد نے اپنی دانست میں سعیدہ بیگم کو مطمئن کر دیا۔

شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہار، بندے، بالیاں، جھمکے، بازو بند، نتھ، جھومر، چوڑی اور کنگن، سبھی زیورات خریدے گئے۔ ریشم کے کسی کپڑے پر زری تو کسی پر زردوزی کا کام شروع ہو گیا۔ سینے پرونے میں ماہر محلے بھر کی لڑکیاں اپنی انگلیوں کے کرتب دکھانے لگیں۔ تلے دانیاں نکل آئیں، دالان میں کہیں سلمے تو کہیں ستارے اور کہیں کلابتو

بکھرے نظر آنے لگے۔ مسالوں کی کٹائی کے لیے ہاون دستے نکل آئے۔ تانبے کے نقشیں خاص دان، گلاب پاش، پاندان، حسن دان، بادیے اور طبق قلعی گر کی دکان پر پہنچ گئے اور تاکید کر دی گئی کہ قلعی کا سب سے قیمتی کشتہ استعمال کیا جائے۔ دیواروں، دروں، طاقوں اور محرابوں کی مرمت ہوئی اور پوری ڈیوڑھی کی پتائی کے بعد شامیانے اور قناتیں لگا کر چھت میں قندیلیں لٹکا دی گئیں اور مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ جگہ تخت بچھا دیے گئے۔ سعیدہ بیگم کی خواہش کے مطابق احمد میاں کی برات میں بستی کے ہندو مسلمان سبھی نے شرکت کی۔ صبا دلہن بن کر آئی تو خوشی میں رات بھر آتش بازی چھوٹتی رہی۔ ولیمے کی دعوت میں قرب وجوار کے گاؤں والوں کو بھی بلایا گیا، اور پھر ڈیوڑھی شہر کے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں منتقل ہوگئی۔ بڑا سا غسل خانہ سمٹ کر باتھ روم بن گیا۔ قدمچوں کا رنگ سفید پڑ گیا۔ چولھے سے گیس نکلنے لگی اور کمروں کی چھتیں اتنی نیچے کھسک آئیں کہ سعیدہ بیگم کا دم گھٹنے لگا۔ اس دن سعیدہ بیگم کو سخت کوفت ہوئی جب ان کا پیتل کا کٹورا انگریزی نسل کے پالتو کتے نے چاٹ لیا اور مانجنے کے لیے ان کے گھر میں تو کیا پڑوس میں بھی راکھ نہ مل پائی۔ سردیاں گزر گئیں۔ نہ سقاوہ، نہ تیتڑا، نہ آتش دان، نہ انگیٹھی، سعیدہ بیگم کے ہاتھ کوئلے کی آنچ کو ترستے ہی رہے۔ ہاں دن میں کئی کئی بار چائے پینے کو ملتی رہی۔

"تم لوگ کتنی چائے پیتے ہو؟ چائے پیتے پیتے میری تو زبان موٹی ہوگئی ہے۔"

آخر ایک دن سعیدہ بیگم نے ٹوک ہی دیا۔

"اور یہ جو تم نے نوکر رکھا ہے بلا کا سست، دوپہر کا کھانا شام ہونے کو آتی ہے تب جا کے پکا پاتا ہے۔ کچھ کہو تو بڑبڑانا شروع۔ کیا یہاں نوکر کم ملتے ہیں؟"

"یہی بہت مشکل سے ملا ہے۔"

احمد نے کہا اور سعیدہ بیگم کی نظروں میں ریاضو، رحیما اور غفور خاں کے سعادت مند چہرے گھومنے لگے۔

"مجھ سے تمہارا یہ چولھا جلانا نہیں آتا ورنہ میں ہی پکا دیا کرتی۔ اور یہ جو سیٹی والا دیگچہ ہے، اس میں کھانا بھلے ہی جلدی پکتا ہو مگر ہوتا بالکل بے مزہ ہے۔ میں نے تو ایک وقت بھی پیٹ بھر نہیں کھایا۔"

احمد مسکرانے لگا، سنبھل کر بیٹھا اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''امی جان اس میں پکا ہوا کھانا بہت مفید ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی بھاپ نکلنے نہیں پاتی، اس لیے سارے وٹامن، مطلب ساری طاقت اندر ہی رہتی ہے۔''

''تو بیٹے تمہارے خیال میں کھوئے میں تو بالکل طاقت نہیں ہوتی ہوگی۔''

الغرض احمد کا کوئی جواب سعیدہ بیگم کو مطمئن نہ کرسکا۔ سرہانے رکھی پان کی پٹاری اٹھائی، پان لگایا، منہ میں رکھا، تھوڑی دیر چبایا اور پھر پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا، وہاں پیکدان نہیں تھا۔ وہ اٹھیں اور برآمدے میں لگے واش بیسن کی طرف چل دیں۔

دونوں وقت مل رہے ہیں۔ روشنی پوری طرح ختم نہیں ہوئی اور اندھیرا پاؤں پسارنے لگا۔ سعیدہ بیگم چھوٹے سے لان کے ایک کونے میں بید کے اسٹول پر تنہا بیٹھی گھنٹوں سے گزرے زمانے کی مالا گوندھ رہی ہیں۔ کیاری میں منی پلانٹ کی بیل باؤنڈری کے سہارے اوپر چڑھ رہی ہے۔ کیاری سوکھ چکی ہے۔ احمد اور صبا کو فرصت ہی کہاں ہے، اور سعیدہ بیگم پانی لگائیں تو کس پودے میں؟ نہ مولسری ہے، نہ چنبیلی اور نہ شہتوت۔ کچھ کانٹے دار پودے ہیں تو کچھ کو گملے میں قید کرکے بونا بنا دیا گیا ہے۔ کسی میں پانی زیادہ لگتا ہے، کسی میں کم اور کسی میں بالکل نہیں۔ اب اس عمر میں اجنبی پودوں سے کہاں تک مانوس ہوا جائے۔ سعیدہ بیگم نے ایک نگاہ چھوٹے سے فلیٹ کی دیواروں پر ڈالی۔ نگاہوں میں ڈیوڑھی کا صدر دروازہ گھوم گیا۔ ان کی پالکی اندر داخل ہو رہی ہے۔ انہوں نے سچے کام کے بھاری دوپٹے کے گھونگھٹ سے جھانکا۔ محلے بھر کی کنواری لڑکیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ اسی طرح مہینوں تک دلہن بنی بیٹھی رہی تھیں۔ اماں بیگم نے سال بھر تک کسی کام سے ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ جب انہوں نے پہلی بار کھیر کی ہنڈیا میں ڈوئی چلائی تو اس پر نیاز دے کر اماں بیگم نے اُسے پورے محلے میں تقسیم کیا تھا۔ پریشر کوکر کی سیٹی نے انہیں چونکا دیا۔ احمد اور صبا کی شادی کو کچھ ہی ہفتے گزرے تھے اور صبا کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ وہ روزانہ سبزی گوشت پھل سبھی کچھ خود ہی خرید کر لاتی ہے۔ انہیں محسوس ہوا کہ صبا کا وجود ان کے چاروں طرف ہیولے کی شکل میں گردش کر رہا ہے اور ان کا اپنا وجود مٹتا جا رہا ہے۔ صبا کہاں جا رہی ہے؟ کون آ رہا ہے؟ کیوں آ رہا ہے؟ کس کے لیے چائے بن رہی ہے؟ کمرے میں احمد کے دوستوں کے درمیان صبا

کن باتوں پر قہقہے لگا رہی ہے؟ سعیدہ بیگم کو کسی بات کا علم نہیں تھا۔ آخر کار ایک دن انہوں نے احمد کو بلایا اور سمجھانے لگیں۔

"بیٹے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ہمارے خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بہو بازار......."

اس پر وہ ہنس دیا اور سعیدہ بیگم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگیں۔ یہ گھر، یہ ماحول، اپنا بیٹا اپنی بہو سب کچھ پرایا سا لگنے لگا اور وہ اپنے بیٹے بہو سے بہت دور ہوتی چلی گئیں۔

ایک دن احمد نے صبا سے پوچھا۔

"تم سے کوئی بات ہوئی ہے امی جان کی؟ کچھ خاموش رہتی ہیں، بالکل گم صم سی۔"

"نہیں تو، مجھ سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے ایک دن پوچھا بھی تھا، پہلے چپ رہیں پھر کچھ اس طرح جواب دیا کہ اس کے بعد کوئی بات پوچھنے کی میری ہمت نہیں ہوئی۔"

احمد سوچنے لگا۔

"معلوم نہیں امی جان کو کیا ہو گیا ہے۔ بالکل غیروں کی طرح برتاؤ کرتی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی........."

وقت گزرتا رہا۔ ریسرچ مکمل ہونے کے بعد اسے عارضی نوکری مل گئی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو اس نے سوچا کہ بیع نامہ ان ہی چھٹیوں میں کر دیا جائے تاکہ باقی روپیہ مل سکے۔ لہٰذا سب کا قصبے جانے کا پروگرام بن گیا۔ سعیدہ بیگم نے ڈیوڑھی میں پہنچ کر سب سے پہلے شہتوت کے پیڑ میں پانی لگایا۔ بنّو کی اماں کو خبر ہوئی تو وہ آ گئیں۔ پوری ڈیوڑھی دھول مٹی سے اٹی پڑی تھی۔

باغیچہ سوکھ کر بنجر ہو گیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ بنّو کی اماں محلے کے دو چار بچوں کو بلا لائیں۔ بدلو سقے کو خبر ہوئی تو مشک بھر کر لے آیا۔ کوڑا کرکٹ ایک طرف کر کے صحن میں چھڑکاؤ کر دیا گیا۔ بنّو کی اماں سعیدہ بیگم کے کمرے کی صفائی میں جٹ پڑیں اور سعیدہ بیگم نے اپنی بہو کے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر ٹھیک کر دیا۔ احمد بازار سے ضرورت بھر جنس لے آیا۔ سعیدہ بیگم نے پوری ڈیوڑھی کو سر پر اٹھا لیا۔

''بنّو کی اماں جلدی سے چاول بین لو۔ بہو کے لیے مزعفر بنانا ہے۔''

''کیا بیگم صاحبہ؟''

''ارے سب کچھ بھول گئیں، زردہ۔ اور کیا؟ اور دیکھو کباب کا قیمہ اچھی طرح پیسنا۔ کمبخت ہریا ابھی تک کھویا لے کر نہیں آیا۔ آج کل کے بچے اتنے کام چور ہیں کہ ذرا سے کام میں جان نکلتی ہے اور یہ نتھن تو کسی دین کا نہیں ہے، میوے منگائے تو سیلے ہوئے لے آیا۔ اب رحیما اور غفور خاں جیسے آدمی کہاں سے آئیں۔''

پھر انہیں کچھ یاد آیا اور چونک کر بولیں۔

''ارے ہاں، چائے کا پانی رکھنا تو میں بھول ہی گئی۔ بہو کو چائے پینے کی عادت ہے، بے چاری نے صبح سے نہیں پی۔''

سعیدہ بیگم بہو کے کمرے میں گئیں تو وہاں صبا کو محلے کی لڑکیاں گھیرے بیٹھی تھیں۔

''یہ کیا............ اب تم گھر جاؤ۔ تھوڑی دیر تو بہو کو آرام کرنے دو۔ کل آجانا۔ بہو کے ہاتھ سے کھیر پکے گی۔ سمجھیں ـــ''

انہوں نے سب لڑکیوں کو رخصت کر کے بہو کو مسہری پر لٹایا اور کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔

احمد نے لالا دیوی سرن کے نام بیع نامہ کر کے بقایا وصول کر لیا۔ دیوڑھی کی تجوری اپنے پرانے انداز میں کھلنے اور بند ہونے لگی، شہتوت کے مرجھائے پتے سرسبز ہو گئے کہ اچانک سعیدہ بیگم کو معلوم ہوا، چھٹیاں گزر گئی ہیں۔ انہیں لگا کہ ابھی تو ایک لمحہ بھی نہیں گزرا اور............

''امی جان کل جانا ہے۔ آپ کی تیاری تو سب ہے نا؟ صبح ذرا جلدی چل دیں گے ـــ''

احمد یہ کہتا ہوا اپنی مچھر دانی میں جا کر سو گیا۔

رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ احمد نے کروٹ لی۔ ایک آہٹ سی ہوئی، آہٹ ڈیوڑھی کے دالان میں ہوئی تھی۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سعیدہ بیگم ہاتھ میں تسبیح لیے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی ہیں۔

'امی جان ابھی تک نہیں سوئیں ــــ؟'

اس نے سوچا۔ اٹھنا چاہا مگر اٹھا نہیں، بس چپ چاپ لیٹا انہیں دیکھتا رہا۔ دالان کی محراب میں لالٹین لٹک رہی تھی جو ہوا کے جھونکے سے ہلنے لگی تھی۔ سعیدہ بیگم کا سایہ کبھی طویل ہو کر دبے پاؤں ڈیوڑھی کی دیواروں پر چڑھنے لگتا اور کبھی سمٹ کر ان کے قدموں میں دم توڑ دیتا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صحن کو پار کر کے باغیچے میں لگے شہتوت کے قریب پہنچیں، پانی سے بھری بالٹی اٹھائی اور شہتوت کے پیڑ میں انڈیل دی۔ وہاں سے لوٹ کر صدر دروازے تک آئیں۔ نقش و نگار والے برسوں پرانے موٹے کواڑ چھوئے، پھر دالان میں لٹکی لالٹین اتار کر زینے کی طرف مڑیں اور سیڑھیاں چڑھنے لگیں مگر آدھی سیڑھیوں تک ہی پہنچی ہوں گی کہ جانے کیا سوچ کر واپس اتر آئیں ــــ!!

○○○

پورٹریٹ

'آج وہ اس پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر جا کر تصویر بنائے گا۔ وہ برسوں سے بھٹک رہا ہے۔ کبھی نالندہ کے کھنڈروں میں اور کبھی بودھوں کے پرانے مندر کے ارد گرد۔ اس نے راجگیر کے برھما کنڈ میں اشنان کرتی دوشیزاؤں کی تصویریں بنائی ہیں تو کبھی کشمیر کی پہاڑیوں سے گرتے جھرنوں کی۔ اس کا برش اجنتا کی خوبصورت وادیوں سے بھی آشنا ہے اور وہ ایلورا کی پتھریلی زندگیوں میں بھی رنگ بھر چکا ہے۔'

اس نے تھیلے میں سامان رکھا، ڈرائنگ بورڈ ہاتھ میں لیا اور گھر سے نکل کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

'چوٹی پر جمی برف کو دیکھنے بہت سے لوگ اوپر چڑھ رہے ہیں۔ راستے میں جگہ جگہ پکوڑوں کے خوانچے اور چائے کی دکانیں ہیں۔ اوپر ایک چھوٹا سا میلا لگتا ہے، جہاں چیزیں بہت مہنگی ملتی ہیں لیکن لوگ سستی چیزیں زیادہ داموں میں خرید کر خوش ہوتے ہیں۔'

اب وہ چوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جہاں لوگ اپنا اپنا قیمتی سامان بیچ رہے

ہیں، اس سے ذرا پہلے ایک بوڑھا فقیر پرانا اوور کوٹ پہنے، جو جگہ جگہ سے پھٹ کر گدڑی کی شکل اختیار کر چکا ہے، ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا ہے۔

''بابو کچھ دیتا جا''۔

فقیر ہر ایک سے سوال کر رہا ہے مگر لوگ اس کو دیکھے بغیر ہی برابر سے گزر جاتے ہیں اور وہ ان کے چہروں کو اس طرح تکتا ہے، جیسے کہنا چاہتا ہو۔

''بابو۔ اے بابو ادھر دیکھ تو لے''۔

اس نے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ جیب خالی ہے۔ جیب خالی تھی۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں لیکن آج فقیر کو کچھ دینے کی خواہش دل میں رہ رہ کر اٹھ رہی تھی۔

لمبی داڑھی اور سفید گھنی بھنویں۔ لمبی لمبی انگلیاں اور ان پر ابھری نیلی نسیں۔ 'یہ کتنی آرٹسٹک لگ رہی ہیں۔ آرٹسٹک! نہیں ...... مجھے یہ نہیں سوچنا چاہیے۔ آخر کتنی مصیبتیں جھیلی ہوں گی اور کتنے فاقے کیے ہوں گے اس بوڑھے فقیر نے، تب اس کی یہ حالت یعنی آرٹسٹک حالت بنی ہوگی۔ کاش اسے کچھ دے سکتا۔ جن کی جیب میں بہت کچھ ہے وہی کون سا دے رہے ہیں۔ پھر یہ درد میرے ہی دل میں کیوں۔ میری جیب خالی ہے شاید اس لیے'۔

وہ بازار سے گزرتے ہوئے اکثر سوچتا کہ جب اس کی جیب میں پیسے ہوں گے تو یہ ڈرائنگ بورڈ خریدے گا۔ وہ برش، گھنے بالوں والا برش بھی لے گا۔ اب اس کے سینڈل بھی پرانے ہو گئے ہیں اور یہ پینٹ کا کپڑا کتنا خوبصورت ہے۔ لیکن جب کوئی پینٹنگ بکتی اور جیب بھری ہوتی تو پرانے ڈرائنگ بورڈ اور گھسے ہوئے برش سے ہی کام چل جاتا۔ 'سینڈل اور یہ پینٹ، سب تو ٹھیک ہے ابھی'، وہ دل میں کہتا اور سینہ چوڑا کیے دکانوں کی طرف بغیر دیکھے ہی بازار سے گزر جاتا۔

'تو کیا آج بوڑھے فقیر کو کچھ دینے کی خواہش بھی ...... ؟نہیں ......'

اس کے دل میں چبھن سی ہوئی شاید کوئی وار ہوا تھا۔ اس کے قدم اچانک رُک گئے اور وہ بوڑھے فقیر کے سامنے سڑک کے اس پار ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔

'یہ تو کچھ اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ اس فقیر کو ضرور دیں گے'۔

ان کے ساتھ ایک سولہ سترہ سال کی معصوم سی لڑکی بھی تھی۔

'کسی انگریزی اسکول کی اسٹوڈنٹ معلوم ہوتی ہے۔ کتنا درد ہے اس کی آنکھوں میں اور کتنے غور سے بوڑھے فقیر کو دیکھ رہی ہے۔ ہاں ہاں دیکھو، وہ فقیر کے قریب سے گزرنا

چاہتی ہے۔ضرور کچھ دے گی۔' لیکن جب وہ اس کے قریب سے گزری تو ناک پر رومال رکھتے ہوئے کانوینٹیئن انداز میں بولی۔

''اُف ڈیڈی، انڈیا سے یہ بھک منگے کب ختم ہوں گے۔''

ڈیڈی نے فقیر پر حقارت بھری نظر ڈالی اور کہا۔ ''چلو بیٹی یہ سب ڈھونگی ہوتے ہیں۔''

فقیر کی داڑھی اور مونچھوں میں چھپے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ شاید بوڑھے نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

اس نے بورڈ پر ڈرائنگ شیٹ لگائی اور ایک کٹوری میں بوتل سے پانی نکال کر برش صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے پوری شیٹ کو نیلا رنگ دیا۔ 'میں نے شیٹ کو نیلا کیوں رنگا؟' وہ سوچنے لگا۔

'کیا اس لیے کہ نیلا رنگ آسمان کی وسعت اور سمندر کی گہرائی کی علامت ہے؟ نہیں —— تو پھر؟ زہر............'

اس نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے فقیر کی جانب دیکھا تو لگا کہ بوڑھے کا چہرہ نیلا پڑ چکا ہے۔شیٹ پر نیلا رنگ کچھ خشک ہوا تو اس نے سب سے پہلے بوڑھے فقیر کے چہرے میں دھنسی آنکھیں بنائیں۔

'کتنی گہرائی ہے ان آنکھوں میں۔'

اس نے فقیر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو کتنے ہی مفکر، فلسفی اور دانش ور نظر آئے جو اس کی گہری آنکھوں کی تہ میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔

'آنکھوں سے سب کچھ کھر چا جا چکا ہے اور اب وہ دھندلی ہو گئی ہیں۔'

بوڑھی پیشانی پر ابھری بے جان شکنیں کسی بلندی پر لے جانے والی سیڑھیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

'سینکڑوں آرٹسٹ ان سیڑھیوں پر بیٹھے تصویریں بنا رہے ہیں اور زمانہ ان کے فن پر داد لٹا رہا ہے۔'

''بابو کچھ دیتا جا.............''، فقیر نے جاتے ہوئے ایک شخص کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔ بڑھے ہوئے موٹے ناخنوں میں بھرا میل، سفید رونگٹے، ابھری ہوئی نیلی نسیں اور چھپکلی کے پیٹ کی طرح ہتھیلی کی زرد کھال۔ محسوس ہوا کہ فقیر کے دونوں ہاتھ کسی

خوبصورت سفید شاہی عمارت کے نقش ونگار بنانے میں مصروف ہیں۔

'کتنی کاریگری ہے ان بوڑھے اور لاغر ہاتھوں میں۔'

اسے لگا کہ بوڑھے فقیر کے دونوں ہاتھ کاٹ لیے جائیں گے۔

'نہیں......'

اور اس نے جلدی سے بوڑھے کے دونوں ہاتھوں کو مٹیالے رنگ سے ڈرائنگ شیٹ پر بنا دیا۔

'چہرہ مکمل ہونے بھی نہ پایا کہ ہاتھ بنا بیٹھا !'

احساس ہوا کہ وہ بوڑھے فقیر کی تصویر بڑی بے ترتیبی سے بنا رہا ہے۔ بوڑھے کی گردن میں اودے رنگ کے پتھروں کی مالا پڑی تھی۔ اس کا برش اودے رنگ میں سن چکا ہے، مگر اب پتھر اپنا رنگ بدل رہے تھے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ 'پتھر پھول بنتے جا رہے ہیں اور کوئی شخص پھولوں سے لدا بوڑھے کے نزدیک کھڑا ہے اور بار بار بوڑھے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مجمع پھولوں سے لدے شخص کی جے جے کار بولتا ہے، اور جب لوگ اسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیتے ہیں تو وہ شخص اس بوڑھے فقیر کی جانب ایک نظر بھی نہیں ڈالتا۔' اس کا گدڑی نما اوورکوٹ عین ناف کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا۔ کھال سوکھ کر چمڑا ہوگئی تھی اور پیٹ کنویں کی طرح اندر دھنس گیا تھا۔ اس نے سوچا، دھنسے ہوئے کنویں کو رنگوں سے اٹا دے مگر لگا کہ اگر رنگوں کے گودام بھی خالی ہو جائیں تو بھی یہ کنواں نہیں اٹ سکتا۔

''بابو کچھ دیتا جا ——''

تصویر بناتے بناتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اپنی ہی آواز گونجی۔ 'پیسا...... پیسا...... ایک پیسا......' اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ آنکھیں میچ کر پیسے مانگنے والا کھیل کھیلتا تو ہمیشہ کوئی بچہ اس کے ہاتھ پر تھوک دیتا۔ اس نے دیکھا کہ بوڑھے فقیر کے پاس سے کوئی بچہ گزر رہا ہے۔ نہ جانے کیوں لگا کہ بچہ ضرور بوڑھے کے ہاتھ پر تھوک دے گا۔ دل دھڑکنے لگا اور رگوں میں دوڑتے خون کی رفتار تیز ہوگئی۔ 'خون —— سرخ خون ——' اب اس نے شیٹ پر چاروں طرف سرخ رنگ پوت دیا تھا۔ رنگ کچھ اس طرح بکھرا کہ شیٹ پر بے شمار لال جھنڈے لہراتے نظر آئے۔ اسے لگا کہ بوڑھے فقیر کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھا۔ تصویر، بوڑھے لاغر اور بے بس فقیر کی تصویر سرخ رنگ کے دائرے میں

کچھ سہم سی گئی تھی۔ آرٹسٹ کی رگوں میں دوڑتے خون کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور اب اس کے برش کا سرخ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ بوڑھے نے پیچھے ہٹ کر درخت کے تنے سے کمر ٹکالی۔ درخت پر پھل لٹک رہے تھے۔ اس نے ڈرائنگ شیٹ پر درخت بنایا اور پھلوں کی جگہ بے شمار سکے لٹکا دیے۔ ایک سکہ درخت سے ٹوٹا، لیکن جب وہ بوڑھے کے پاس آ کر زمین پر گرا، تو سکہ نہیں کسی پرندے کا کترا ہوا کچا پھل تھا۔

اب تصویر مکمل ہو چکی تھی ———

''کتنی خوبصورت پورٹریٹ ہے۔'' کسی نے کہا۔

''..........................''

''جی ہاں آرٹسٹ نے کلر کمپینیشن پر بہت زور دیا ہے۔'' دوسرا بولا۔

''یہ آپ کے نئے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں..................''

''ہاں ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ مگر آئل پینٹنگ ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔''

''لیکن صاحب آئیڈیا دیکھیے۔ وہ دیکھیے وہاں سے کچھ نیچے آ کر پیڑ سے ٹوٹا ہوا سکہ کسی پھل کی سی شکل اختیار کرنے لگا ہے اور زمین پر آتے آتے..............''

''ہاں بھئی پینٹنگ تو بہت اچھی ہے۔ کتنے کی ہے یہ پورٹریٹ ؟''

'کتنے بتاؤں...... جو مانگوں گا وہی ملے گا آج تو۔'

وہ ذہن میں جو دام مقرر کرتا وہ کبھی زیادہ لگتے کبھی کم۔ دونوں شخص سامنے کھڑے اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک اس نے کچھ کہا۔ کیا کہا؟ یہ وہ خود نہیں سن سکا لیکن جب سامنے والے شخص نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اس کی بتائی ہوئی رقم دہرائی تو اس نے سوچا ———

'ایں یہ کیا! میں نے صرف اتنے ہی مانگے ! اس سے زیادہ میں سوچ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ خیر اتنے ہی کافی ہیں۔ یہ سب پیسے بوڑھے فقیر کو دے دوں گا۔ اسے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑے گا۔ ان پیسوں سے وہ کوئی چھوٹا موٹا دھندا کر سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو پتھر کی مورتیاں اور موتیوں کی مالائیں بیچنے لگے گا۔'

''یہ لو........اس سے زیادہ نہیں۔ ابھی تو فریم بھی بنوانا ہے۔''

'نہیں صاحب اس سے کم نہیں،' اس نے کہنا چاہا مگر منہ سے کچھ نہ نکلا اور چپ

چاپ دی ہوئی رقم ہاتھ میں تھامے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

'کتنا خوش ہو گا بوڑھا فقیر۔ اتنی بڑی خوشی زندگی میں پہلی بار ملے گی۔'

جب وہ بوڑھے کے پاس پہنچا تو اس نے ہاتھ پھیلا کر سوال کیا۔

''بابو کچھ دیتا جا —— کچھ دیتا جا بابو——''

چاہا کہ جھک کر اس کے ہاتھ پر سارے روپے رکھ دے مگر اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ قریب سے گزر رہے ہیں۔

اس نے ہاتھ روک لیا۔

'کیا سوچیں گے یہ لوگ۔ سمجھیں گے میں کوئی پاگل ہوں۔'

وہ وہیں کھڑا لوگوں کے گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔

'میں یہاں کھڑا ہوں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ میں اس طرح کیوں کھڑا ہوں شاید وہ سوچ رہے ہوں گے۔'

وہ دو چار قدم ٹہلتا ہوا آگے بڑھا اور پھر پیچھے لوٹ آیا۔ بوڑھا حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

'بوڑھا حیرت زدہ ہے، شاید میں نے فقیر کے ہاتھ پر نوٹوں کی موٹی گڈی رکھ دی ہے۔'

اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور فقیر کی طرف دیکھا۔ فقیر بھی مسکرا رہا تھا گویا وہ فقیر نہ ہو قد آدم آئینہ ہو۔

آئینے میں کسی احمق کا چہرہ دکھائی دیا۔

'فقیر پھر مسکرا رہا ہے، دل ہی دل میں ہنس رہا ہے گویا سوچ رہا ہو کہ عجب سر پھرا شخص ہے۔'

اب آرٹسٹ کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ بوڑھے نے کھنکارا تو اسے لگا کہ بوڑھا فقیر قہقہہ مار کر ہنس پڑا ہے۔

''بابو کچھ دیتا جا——''

فقیر نے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ خالی تھا۔ آرٹسٹ نے اپنے ہاتھ پر نظر ڈالی، اس کے اپنے ہاتھ میں نوٹوں کی موٹی گڈی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ بوڑھے نے اس کی ذہنی حالت پر ترس کھا کر پیسے لوٹا دیے ہیں۔ پل بھر کے لیے لگا کہ وہ خود فقیر کی جگہ بیٹھا بھیک مانگ رہا ہے۔

ہاتھ خود بخود پیٹ پر پہنچ گیا۔

'بھوک لگ رہی ہے۔'

بھوک تو اس وقت بھی لگ رہی تھی جب وہ گھر سے نکلا تھا۔

'پہلے چل کر کچھ کھالیا جائے۔' اس نے سوچا اور سامنے چائے کے ہوٹل میں گھس گیا۔ ہوٹل کا بل چکانے کے بعد باقی روپیوں کو ہاتھ میں تھامے ٹہلتا ہوا پھر بوڑھے فقیر کے قریب آن پہنچا۔ فقیر نے کنکھیوں سے دیکھا اور تار تار اوورکوٹ کی جیب کو گھٹنوں میں دبا کر محفوظ کرلیا۔

'کمبخت سوچ رہا ہے میں کچھ چھین کر بھاگ جاؤں گا۔'

اس نے نفرت سے فقیر کی طرف دیکھا۔ 'وہ اوندھے منہ پڑا تھا اور بہت سارے چاندی کے سکّے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ پولیس والوں نے تلاشی لی تو گدڑی سے نوٹوں کی گڈیاں نکلنے لگیں۔ اخبار والوں نے فوٹو کھینچے۔ پلیٹ فارم پر بھیک مانگتا تھا۔ نحیف و نزار فقیر ــــ اس بوڑھے سے بھی بدتر حالت تھی اس کی۔'

اب آرٹسٹ کے ہاتھ میں چند روپے تھے۔ باقی ڈرائنگ شیٹ اور رنگ خریدنے کے لیے جیب میں رکھ لیے تھے اور گھوم کر فقیر کے پیچھے آ گیا تھا۔ بوڑھا پہلو بدلنے لگا اور بیساکھی بھی کھسکا کر قریب کر لی۔

'نہ جانے کیا سمجھ رہا ہے۔ مگر مجھے اس سے کیا غرض۔ مجھے تو اس کی مدد کرنی ہے۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو پورے پیسے ہی دے دیتا۔ خیر اتنے بھی اس کے لیے کافی ہیں۔'

بوڑھا کھانسا تو لگا کہ بوڑھا پھر زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا ہے۔ اس کا وہ ہاتھ جس میں روپے تھے لرز گیا۔ یاد آیا کہ جب اس نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا تھا اور اپنے ایک امیر دوست سے کچھ پیسے ادھار مانگنے گیا تھا تو کتنی دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ کئی بار مانگنے کی کوشش کی مگر کوئی سہارا ہی نہیں مل پایا کہ کس طرح بات شروع کرے۔ کسی امیر سے کچھ مانگنا کتنا مشکل ہے۔ کیسی عجیب کیفیت تھی وہ۔ مگر آج کسی غریب کو اتنے روپے دینا، ٹوٹے سینڈل اور پھٹی پتلون پہن کر اتنے روپے دینا اس مانگنے سے کہیں زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر فقیر کو پیسے دینے کی کوشش کی مگر لگا کہ اس کے چاروں طرف بھیڑ جمع ہے اور وہ سر پر راجا ہریش چندر کا مکٹ باندھے اسٹیج پر کھڑا کوئی کرتب دکھا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کشتی لڑ رہا تھا کہ اسے اڈی پہلوان یاد آ گیا۔

'اڈی پہلوان نے اس رکشے والے کو، جس سے ایک لالا چند پیسوں پر جھگڑا کرر ہاتھا، کس شان سے ایک بڑا نوٹ دیا تھا۔'' کیوں جھگڑ رہا ہے بے۔ یہ لے۔ یہ عزت دار لوگ کیا دیں گے۔ انہیں تو غریبوں کو دیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بے عزتی ہوتی ہے ان کی۔ دینے کے لیے اڈی کا دل چاہیے۔'' سچ ہی کہا تھا اڈی نے۔ دینے کے لیے اڈی کا دل چاہیے۔ علاقے کے بدمعاش اڈی کا——'

اڈی پہلوان نے راجا ہریش چندر کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ چاروں خانے چت۔ اس نے گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے سے کچھ لوگ آرہے تھے۔

'ارے یہ تو وہی لڑکی ہے ——'

لڑکی نے اسے فقیر کے قریب کھڑا دیکھا تو مسکرا دی۔

'یہ کیوں مسکرا رہی ہے۔ کیا اسے معلوم ہے کہ میں فقیر کو اتنے پیسے .... کیا میں شکل سے احمق معلوم ہوتا ہوں؟'

آرٹسٹ نے نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے کی کوشش کی، پھر بھنویں سکوڑیں اور بولا۔

''نہ جانے انڈیا سے یہ بھک منگے کب ختم ہوں گے''۔

اب اس کانونٹیئن لڑکی کے رومال کی خوشبو آرٹسٹ کے جسم میں اتر گئی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی کے سارے نوٹ جیب میں رکھے اور ایک سکہ نکال کر بوڑھے فقیر کے ہاتھ پر اس طرح ڈال دیا جیسے سکہ نہ ڈالا ہو بلکہ تھوک دیا ہو۔ فقیر کا ہاتھ سکے کے بوجھ سے کپکپانے لگا——

''بابو تیرا بھلا ہو——''

اس نے دیکھا کہ لڑکی کے ڈیڈی اب بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ وہ اس طرح چونکا جیسے ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے، اور بول پڑا۔

''صاحب یہ لوگ کیسا ڈھونگ رچائے رہتے ہیں ——''

اور یہ کہتا ہوا تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا——

کچھ دور جانے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں شخص، جنہوں نے اس کی پورٹریٹ خریدی تھی، بوڑھے فقیر کے وجود سے بے خبر، ہنستے ہوئے اس کے سامنے سے گزر رہے تھے اور بوڑھا ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا تھا۔

''بابو کچھ دیتا جا——''

○○○

صبحِ کاذب

آج امی چند بہت خوش ہے، پاور ہاؤس میں اسے ہیلپر کی نوکری مل گئی ہے۔ وہ پہلی بار ڈیوٹی پر جا رہا ہے۔

”اماں ....لا جلدی سے جھولے میں روٹی رکھ دے۔“

اس نے پچھلے پہیے کی رم کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ دونوں پہیوں میں ہوا دیکھی اور کور پھٹی گدی پر پرانی قمیص کو اچھی طرح باندھنے لگا۔ اماں نے اس کی پگڑی...... 'پگڑی؟' ہاں، سر پر باندھنے کے لیے تولیا لا کر دے دیا۔ اس نے اچانک چاک کی جیب کو ٹٹولا، ماچس اور بیڑی کا بنڈل تو تھا مگر چھوٹی کنگھی اُسارے کے اوٹے پر ہی رہ گئی تھی۔ اوٹے سے کنگھی اٹھاتے وقت اس نے پھر ایک بار شیشے میں اپنا منہ دیکھا، بائیں آنکھ کے کاجل کو کچھ پھیلا ہوا پایا تو قمیص کی دامن سے ہی رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔ جھولے کو ہینڈل میں لٹکا کر پیڈل پر پیر

رکھے بغیر ہی اچھل کر گدی پر بیٹھ گیا۔ چبوترے کی سیڑھیوں سے سائیکل کداتا ہوا پگڈنڈی اور پھر دگڑے سے ہوتا پاور ہاؤس کی طرف چل دیا۔

امی چند کے جانے کے بعد اس کے بوڑھے باپ سکھو رام نے، جو کئی سال سے دمے کے مرض میں مبتلا تھے، امی چند کی ماں کو ہانپتے ہانپتے آواز دی اور پھر بری طرح کھانسنے لگے۔

''کا بھیو؟ پھر سانس اکھڑ گئی کا؟''

امی چند کی ماں جو گیہوں پھٹک رہی تھیں سوپ سمیت آن کھڑی ہوئیں۔

''تو ہی کچھو امی چندا کو سمجھا، یا چھوکرا کی تو اکل ماری گئی ہے۔ پہلے بیل بیچے، میں نے پوچھو تو جے کہہ کے ٹال دینو کہ مجور ہے گئے ہیں۔ کل دن مندے سمو کو بلا کے کوڑیوں کے دام ہل بھی بیچ دینو۔ پچاس سال سے سینت سینت کے رکھی بھئی سگری اجت یا چھوکرا نے چار دِنا میں ہی گھورے میں ملا دینی .... ہے رام۔''

امی چند کی ماں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''نئے چھوکرن کو کون سمجھائے، اور پھر جو دو چار کتابیں پڑھ لیں وِن کو تو سمجھانو ہی بے پھجول ہے۔''

وہ سوپ میں گیہوں کے دانوں کو ہلاتی ہوئی اسارے میں جا بیٹھیں اور گیہوں پھٹکنے لگیں۔

سکھو رام نے کھاٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر لٹھیا کھینچی اور دونوں پیر زمین پر اتار کر لاٹھی کے سہارے کھڑے ہو گئے، پھر کپکپاتی ٹانگوں سے چلتے ہوئے لڑاونی کے پاس آن بیٹھے۔ لڑاونی میں بھوسے کے چند تنکے پڑے تھے اور پاس ہی دو خالی کھونٹے جن پر سوکھا ہوا گوبر چپکا تھا، منہ اٹھائے سکھو رام کو تکے جا رہے تھے۔ سکھو رام نے بیٹھے ہی بیٹھے لڑاونی میں پڑے بھوسے کے تنکوں کو اپنی بوڑھی انگلیوں سے اس طرح ادھر اُدھر کیا جیسے وہ بیلوں کو سانی لگا رہے ہوں۔ سنہری تنکوں میں سورج کی کرنوں سے پیدا ہونے والی چمک سے ان کی آنکھیں چندھیا سی گئیں اور آنکھوں کے سامنے ہرے لال نیلے پیلے دائرے تھرتھرانے لگے۔

'اپنا جوارا' اپنا گھیر' بھوسے کی برجیاں، گھر کا راتب، اپنی ہی سرسوں سے نکلی ہوئی کھل اور سب سے بڑھ کر اپنی عزت، سبھی کچھ تو ہے ان کے پاس ...... ہے نہیں تھا۔'

انہیں محسوس ہوا کہ گلے میں بھوسے کا سوکھا تنکا پھنس گیا ہے۔ وہ کھنکارے اور پھر

زور زور سے کھانسنے لگے۔ امی چند کی ماں بڑبڑاتی ہوئی آئیں اور انہیں وہاں سے اٹھا کر کوٹھری میں لے گئیں۔

شام ہو رہی ہے۔ تھکا ماندہ سورج غروب ہونے کو ہے۔ امی چند ڈیوٹی سے واپس آ چکا ہے۔ سکھو رام کھانس رہے ہیں۔ انہوں نے امی چند کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا ہے۔

''تو کو جے کا سوجھی ہے رے، جب ہل بیل ہی بیچ ڈارے تو کھیتی کا ہے سے کرے گو۔ کچھو پرکھن کی اجت کو کھیال ہے کہ نہ۔''

امی چند نے چاک کی جیب سے بیڑی کی پڑیا نکالی اور سکھو رام کی ادھ بجھی چلم میں چنگاری ڈھونڈنے لگا۔

کہیں کوئی چنگاری نظر بھی آئی تو اس سے بیڑی نہ جل سکی۔ جلتی بھی کیسے، اس کی بیڑی تو جوان تھی اور چلم کی آگ اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ اس نے بیڑی کو چلم کی راکھ میں ہی مسل دیا اور بولا۔

''اب جمانا بدل گیا ہے بابا۔ کسانوں نے ٹیکٹر کھرید لیے ہیں۔ اب کوئی بیلوں کا محتاج نہیں ہے۔ اب تو دسیوں دن کی جتائی دو گھنٹے میں ہی ہو جاتی ہے۔ بوائی بھی ٹیکٹر ہی سے کر لو۔ رہٹ وہٹ کے چکر میں کون پڑے، چوکھے لال جی نے اپنی چکی میں ہی ٹوویل لگوا لیا ہے۔ تھریشر بھی لے آئے ہیں۔ اِدھر پھسل کٹی اُدھر گیہوں نکلے۔ نہ ورشا کا ڈر، نہ ہوا کی آس۔ یا جمانے میں سرکار کسانوں کو بڑی سبدھائیں دے رہی ہے۔ ریڈیو میں کسانوں کے لیے پروگرام، تھریشر اور ٹیکٹر کا روج پرچار۔ اب پہلے جمانے تو لد گئے بابا۔ تم تو بس چلم گڑگڑاتے رہو، میں سب کام سنبھال لوں گا۔''

''چوں للّا، کا تو ٹیکٹر کھریدے گو؟ جے کتے روپیا میں آئے ہے؟''

سکھو رام کی آنکھوں کے پپوٹوں پر پڑی جھریاں اور زیادہ ابھر آئی تھیں۔ امی چند کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی، کہ اب ہر بات انہیں سمجھاؤ۔

''نہیں بابا، ٹیکٹر کی کیمت تو ہماری سگری کھیتی سے بھی ادھک ہے۔ کیسر والے پردھان جی کے پاس ہے، وہ جتائیاں بھی کرتے ہیں۔ چوکھے لال جی نے بھی ان سے ہی اپنے کھیت کی جتائی کروائی ہے، اور پھر اگلے سال تو چوکھے لال جی بھی لے آئیں گے۔''

اس نے جلدی سے اپنی بات ختم کی اور اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ سکھو رام پھر

کھانسنے لگے، شاید ان کی سانس اکھڑ گئی تھی۔

امی چند نے چوکھے لال کے ٹیوب ویل سے کھیت کا پلیوا کرلیا، کھیت کے اوٹ آنے پر کسیر والے پردھان جی کا ٹریکٹر منگوا کر ہیرو سے دوبار جتائی کروادی۔ جب کھیت ذرا پھر یرا ہو گیا تو کلٹیویٹر سے پھر دوبار جتوا کر پٹرا لگوا دیا۔ ربیع کی فصل ہر طرف بوئی جا رہی تھی۔ علاقے میں ایک ہی ٹریکٹر تھا۔ چند بوڑھے کسان ہی لٹراونی میں سانی لگانے اور جانوروں کے گوبر اٹھانے کے قائل رہ گئے تھے۔ باقی کسانوں کا نوجوان طبقہ ہل بیل کے چکر سے آزاد کسی چھوٹی موٹی نوکری اور ٹریکٹر، ٹیوب ویل کے بھروسے پر کھیتی میں ہی اپنی بھلائی سمجھتا تھا۔ ٹریکٹر کو فرصت نہیں تھی اور امی چند کا کھیت سوکھا جا رہا تھا۔ اگر کچھ دن اور بوائی نہ ہوئی تو اسے دوبارہ پانی لگوانا پڑے گا۔ اس سال یوں بھی بارش کم ہوئی ہے، کھیت میں نمی ہے ہی نہیں——

اس نے کسیر کے کئی چکر لگائے مگر کبھی ٹریکٹر خراب اور کبھی پردھان جی نجی کھیت بونے میں مصروف۔ وقت نکلا جا رہا ہے، وہ کیا کرے؟ اس نے تو اپنے ہل بیل بھی بیچ دیے ہیں۔ جو رقم ملی تھی، بلاک سے بیج لے آیا، باقی روپیوں میں ڈی۔ اے۔ پی، پوٹاش اور یوریا کھاد کے کٹے۔ اور ٹریکٹر کی جتائی؟ وہ تو رہٹ بیچ کر دی تھی۔

جب اسے ٹریکٹر ملنے کی بالکل امید نہ رہی تو ویدو ہلوا ہے سے مہنگے داموں بوائی کروالی۔

ویدو تو پرلے درجے کا بے ایمان ہے ہی، اس نے سہاگے کے بھی الگ سے دام وصول کر لیے۔

'فصل تو اچھی جمی ہے۔ کیوں نہ جمتی، کھاد بھی تو خوب لگایا ہے اس نے۔ مگر پانی؟ آج تو مہینہ بھر ہو گیا کھیت بوئے ہوئے'

"یہ آکاش وانی کا دلی کیندر ہے۔ سات بجنے کو ہیں۔ اب ہمارا کرشی جگت پروگرام آرمبھ ہوگا۔ ہاں تو منشی بھائی آج چرچا کا وِشے ہے، فصل بونے کے اکیس دن بعد پانی کی اہمیت۔ ہاں رام پھل بھائی اگر بوائی کے بیس سے پچیس دن کے درمیان پانی نہ دیا تو پیداوار آدھی سے بھی کم رہ جائے گی۔ پہلا پانی اکیسویں دن دینا اتی آوشیک ہے......"

سوکھے کا سال......کھیت خشک پڑے ہیں۔ بارش کی ایک بوند بھی نہیں گری۔

بمبا بھی نہیں آتا۔ کیا نہریں بھی خشک ہوگئی ہیں؟ چوکھے لال جی بھرائی کے پیسے بڑھاتے جارہے ہیں۔ نوکری میں ملتا ہی کتنا ہے؟ بابا کی بیماری .... اور پُنیا ...... وہ بھی کب تک انتظار کرے۔ اگر چوکھے لال نے پانی نہیں دیا تو ...... چوکھے لال بھی کیا کریں؟ بجلی دن بھر میں چار ہی گھنٹے تو آتی ہے۔

''رام رام ...... چوکھے لال جی۔''

''آج کل کے چھوکرے کتے منہ جور ہے گئے ہیں۔ پالاگن بھول گئے، رام رام کرے ہیں اور وہ بھی نام لے کے۔''

دل ہی دل میں چوکھے لال نے سوچا۔

''رام رام۔ آؤ امی چند بیٹھو بھیا ——''

بیٹھنے کو تو کہا مگر کھاٹ پر جگہ نہ دی۔ وہ ٹیوب ویل کی پکی کنڈی پر بیٹھ گیا۔

''چوکھے لال جی، اِتے دن ہوگئے کہتے کہتے۔ کل ہمارے کھیت میں بھی پانی چھوڑ دو .... میں تو ڈوٹی پر جاؤں گا۔ چھدّا کو ٹھے کردیا ہے، سیرے کسلا لے کے آجائے گا۔''

''کل کا ہے ...... پانی تو آج ہی لے لو ...... پر ایک بات ہے بھیا۔''

''بات!''

''ہاں .... کل بھی تو کو، دِکھوایو، پر تو' پاور ہوج ڈوٹی پر گیو ہو۔ وہ بات جے ہے کہ کل تیرے کھیت کے پلنگ وارے کئی کسان آئے ہے۔ یا سال برسا تو بھئی نہ ہے۔ ڈیجل بھی نہ مل ریو ہے جو ٹرولی سے پانی لگوالیں۔ بڑی دِکّت ہے پانی کی۔ اگر تو اپنے کھیت سے برہا دے دے تو سبن کی دِکّت دور ہے جائے۔ موئے بھی چار پیسے کی آمدنی بڑھ جائے گی۔''

''لیکن چوکھے رام جی یہاں سے وہاں تک برہا نکالنے میں میری تو آدھے بیگھا پھسل ماری جائے گی اور پھر برابر میں تمہارا کھیت بھی تو ہے۔''

چوکھے لال کی تیوری چڑھ گئیں۔

''موئے اپنے کھیت سے برہا نکالنو ہوتو پھر توسے کاہے کہتو۔''

''مگر جب تمہارے کھیت سے برہا نکل سکے ہے تو میں اپنی آدھے بیگھے پھسل کیوں

کھراب کروں۔"

امی چند ٹیوب ویل کی کنڈی سے اٹھا، پیچھے پجامہ جھاڑا۔ "چھدا اکل سیرے کسلا لے کے آجائے گا۔" کہتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

دوسرے دن ڈیوٹی سے لوٹ کر جب اس نے دیکھا کہ کھیت میں پانی نہیں لگا ہے تو وہ سیدھا چھدا کے گھر جا پہنچا۔

"چھدا ...... چھدا ...... ارے کہاں مر گیا؟"

"رام رام بھیا۔ آ گئے ڈیوٹی سے ——"

چھدا اپنی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

"ہاں۔ مگر تو نے پانی کیوں نہ لگایا —؟"

"وہ چوکھے لال جی نے دیو ہی نہ —"

"کیا بولے ؟"

"کہن لگے پانی وانی کچھو نہ ہے۔ بھاگ جایاں سے ...... جب تائیں بر ہانہ نکلے گو پانی وانی نہ ملے گو۔ کہد یو واہیڈ بابو سے ——"

امی چند خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیسی نظریں پھیری ہیں چوکھے لال نے۔ گاؤں والے بتاتے ہیں کہ جب چوکھے لال چھوٹا تھا تو حکم نہ ماننے پر رائے صاحب نے اسے برگد سے بندھوا دیا تھا اور پورے بدن پہ گڑ اس طرح ملوایا تھا جیسے تیل کی مالش کرتے ہیں۔ دن بھر پیڑ کے چیونٹے کاٹتے رہے تھے۔ خوب بلبلاتا ہوگا۔ پورے گاؤں کے نوجوانوں میں ایک بابا ہی تھے، جن کی رائے صاحب بھی عزت کرتے تھے۔ کرتے بھی کیوں نہ، ضلع بھر کے بڑے بڑے کانگریسی نیتا جو ہمارے گھر آتے تھے۔ آخر بابا کے کہنے سے ہی رائے صاحب نے اسے چھوڑا۔ چیونٹوں کا کاٹنا تو بھول گیا مگر گڑ کا ایسا اثر ہوا کہ میٹھا بن بن کے ڈستا ہے۔

"کا سوچ رہے ہو بھیا۔

"کچھو نہ ——"

اور امی چند وہاں سے چل دیا۔ جب وہ چوکھے لال کی چکی پر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھے۔ ان کے گھر گیا تو دیکھا، باہر بیٹھک میں لکشمی جی کی پوجا کر رہے ہیں۔ سائیکل چبوترے سے لگا کر کھڑی کی اور وہیں بیٹھ گیا۔

''جے لکشمی ماتا میا جے لکشمی ماتا۔''

چوکھے لال پیتل کی تھالی میں گھی کا دیا جلائے لکشمی دیوی کی آرتی اتار رہے تھے اور آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر اونچی آواز میں گا رہے تھے۔

''مہا لکشمی جی کی آرتی جو کوئی نر گاتا۔ اُر آنند سماتا پاپ اتر جاتا۔

جے لکشمی ماتا میا جے لکشمی ماتا............

پوجا کے بعد چوکھے لال نکلے، امی چند دروازے پر ہی بیٹھا تھا۔

''ہم کوئی مپھت پانی تھوڑی مانگ رہے ہیں۔ نگد پیسے دیں گے۔''

''کہہ دیونا، جب تائیں بر ہانہ نکلے گو، پانی نہ ملے گو۔''

''چوکھے لال جی...... رائے صاحب تو یہاں سے جمیداری چھوڑ گئے۔ اب تو تم ہی جمیدار بن بیٹھے ہو۔ مگر اب دیس سوتنتر ہے۔ اب گریبوں کے کھون چوسنے کی یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔ اب رات کا اندھکار چھٹ چکا ہے چوکھے لال جی۔''

ٹیوب ویل کی گڑگڑاہٹ کے عادی کانوں نے امی چند کی رگوں میں کھولتے خون کی گڑگڑاہٹ کو بھانپ لیا۔

''دیکھ امی چند۔ تو یا بکھت تھکو بھو ہے اور گُسّے میں ہے...... اب تو ہی بتا، دیس سوتنتر ہو یا نہ ہو، جب تیرے پاور ہوج سے بجلی آوے ہی نہ ہے تو میں پانی کاں سے دیؤں۔ اور پھر پرلی اور کے سب کسانن کو کہنو ہے کہ جب امی چندا نے بر ہانہ دیو تو وا کو بھی پانی نائیں ملنو چاہیے......اب میں کا کروں...... آگے تیری راجی مگر میرو ٹو ویل تو کھالی ہے نہ بھیا—''

'دیش سوتنتر ہے............ رات بیتتی جا رہی ہے۔ آدھی سے زیادہ بیت بھی گئی ہے مگر ہے تو ابھی رات ہی۔ وہ اسارے میں پڑا بیڑی پہ بیڑی سُلگا رہا ہے۔ بیڑی............؟ ہاں وہ خود بھی سلگ رہا ہے۔ اس نے کھانا نہیں کھایا مگر بھوک نہیں ہے۔ بیڑی کا بنڈل ختم ہو گیا ہے۔ اس کی بھوک بھی تو ختم ہو گئی ہے۔ مگر پیاس............! پانی......!

وہ لیٹا ہے............ نہیں وہ تو کام میں مصروف ہے۔ کام؟ ہاں ......اپنے کھیت میں پانی لگا رہا ہے۔ فصل لہرا رہی ہے، بال سنہری ہو چکی ہیں۔ کٹنے کا وقت آ گیا۔ اس نے فصل کاٹ کر کھلیان میں لگا دی ہے۔ کھلیان اس کے لانک سے بھر گیا ہے۔ وہ لانک سے بہت دور کھڑا ہے، اگر قریب پہنچ گیا تو بدن سے بجلی نکلے گی اور فصل جل جائے گی، راکھ

ہو جائے گی، وہ پاور ہاؤس میں کام کرتا ہے نا۔ مگر وہاں کی راکھ بھی تو بکتی ہے۔ ٹرک بھر بھر کے جاتے ہیں۔ لیکن وہ راکھ پاور ہاؤس کی ہے اور یہ..........'

بیڑی کی چنگاری اڑی اور چھپر کی طرف لپکی۔ وہ چونک کر اٹھنے ہی والا تھا کہ چنگاری راستے میں ہی بجھ گئی اور وہ منہ پھیر کر سو گیا۔

'اس کی فصل دو مہینے کی ہو چکی ہے مگر پانی.......... بھگوان نے بھی تو ایک بوند نہیں برسائی۔ جیوتشی جی بتلا رہے تھے، اس ورش مہاوٹ بھی نہیں ہوگی۔ وہ تو مورکھ نکلا۔ چوکھے لال کو اپنے کھیت سے برہا دے دیتا، اتنی ہان تو نہ ہوتی ـــــ مگر اب کیا۔ اب تو چوکھے لال نے اپنے ہی کھیت سے برہا نکال لیا ہے۔ اب تو وہ کسی حال میں بات کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہاتھ پاؤں بھی جوڑے مگر نہ مانے ـــــ''

آج کل ریڈیو بتلا رہا ہے کہ بجلی کی کمی ہے، ڈیزل بھی نہیں مل رہا ہے۔ کسان بھائیوں کو چاہیے، ہل بیل سے کام لیں اور پانی رہٹ یا ڈھینکلی سے لگائیں۔ ورشا نہ ہونے کے کارن نہروں میں پانی کم ہے۔

'رہٹ؟'

رہٹ تو بک گئی۔ ہل بیل بھی ٹریکٹر نے کچل ڈالے۔ ٹریکٹر کی گڑگڑاہٹ......

ارے یہ تو بادل گرج رہے ہیں۔

آج ورشا ضرور ہوگی۔ ہے بھگوان سن لے..........

دو دن تک بادل منڈلاتے رہے مگر ایک بوند بھی پرتھوی پر نہ آئی۔ آج گاؤں میں کتھا ہوگی۔ اندر دیوتا کو خوش کرنے کے لیے ناچ بھی ہوگا۔ چوپال میں تخت بچھ گئے ہیں۔ بھنگ گھٹ رہی ہے۔ اندر کی سبھا میں ناچ ہوگا پھر بارش ہوگی۔ بابا کی پگڑی اماں نے رنگ دی ہے۔ بابا بھی آئیں گے۔ بابا کا بڑا مان ہے۔ گاؤں کے پرانے مکھیا ہیں بابا.......... مگر فصل ماری گئی تو سال کیسے گزرے گا؟ کس سے ادھار قرض لیں گے بابا؟ نہیں.......... فصل کیسے ماری جائے گی۔ ورشا تو ہوگی ہی.......... چوپال میں تخت بچھ چکے ہیں۔ رانی بائی آ گئی ہیں...... ناچ ہوگا۔ بھانگ گھٹ رہی ہے۔ گاؤں کے بُرکھے بیٹھے ہیں۔ چوکھے لال کلف لگے کپڑے پہن کے آئے ہیں اور سر پر بسنتی رنگ کی پگڑی باندھ رکھی ہی۔ رانی بائی تخت پر آ گئی ہیں۔ جھمکا پرشاد نے ڈھولک سنبھال لی ہے۔ ڈھولک کی پہلی تھاپ.......... رانی بائی کا دایاں پیر..........'

"اندر اندر رُتے رُتے بیتی رے عمریا۔ میٹھے میٹھے سپنوں کی میں بھرلائی گگریا"
چوکھے لال نے کمر سیدھی کرکے اس طرح سینہ پھلایا جیسے راجا اندر سنگھاسن پر بیٹھے پکھراج پری کا ناچ دیکھ رہے ہوں۔
رانی بائی ایک پیر تخت پہ جما کے جو پھرکی کی طرح گھومیں تو پشواز کولہوں تک آکر چھتری بن گئی۔
"ناتھ تیرے درشن کی پیاسی میں ابلا اک ناری ہوں۔ اب کیا پربھو جی بھول گئے ہو داسی کی ڈگریا۔"
"اندر اندر رُتے رُتے بیتی رے عمریا......"
رانی بائی کے دونوں پیر، دونوں ہاتھ، گردن اور کمر اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ جھمکا پرشاد کو پسینا آ گیا۔ امی چند ایک کونے میں بیٹھا تھا۔
"درشن بن دو وُ نینا ترسیں سن لو بہت دکھاری ہوں۔ ہیرا روپ سے درشن دے دو ڈالو ایک نجریا۔"
"اندر اندر رُتے رُتے بیتی رے عمریا......"
"دیکھو حرام جادہ کیسے جھوم جھوم کے بھجن سن رہا ہے۔ من ہی من میں ورشا نہ ہونے کی پرارتھنا کر رہا ہوگا۔"
امی چند نے دیکھا چوکھے لال کَنی انگلی میں بیڑی دبائے لمبے لمبے کش لے رہے تھے اور رانی بائی کے ہر ٹھمکے پر اچھل اچھل جاتے تھے۔
وِسنا نے سِین چلائی اور امی چند کو گھیر میں بلالیا۔ اندر بھنگ گھوٹی جا رہی تھی۔ امی چند کو بغیر پیے ہی چڑھی ہوئی تھی، دو کُلھڑ اور چڑھا لیے۔
"حرام جادے کی ٹانگ گھسیٹ کر تھانے لے جاؤں گا۔ پردھان منتری کا حکم ہے، کسانوں پر جُلم ہونے سے روکو۔ وہ گت بنے گی تھانے میں کہ یاد رکھے گا جندگی بھر۔"
وِسنا نے ٹوکا۔
"کا بڑ بڑا ریو ہے رے امی چندا............؟"
"بڑی تیج بھنگ گھوٹی ہے۔ ترنت ہی چڑھی گئی۔"
یہ کہتا ہوا امی چند باہر نکلا تو دیکھا، چوکھے لال اٹھ کر جا رہے ہیں۔ وہ بھی پیچھے پیچھے

ہولیا۔ چوکھے لال کی رفتار بڑھ گئی۔ امی چند بھی تیز تیز قدم رکھنے لگا۔ چوکھے لال نے مڑ کر دیکھا، شاید اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ہمت نہ ہوئی۔ اب وہ کاچھی ٹولے والی گلی میں مڑ گئے تھے۔ امی چند نے لپک کر انہیں پکڑ لیا۔

''ارے امی چند کاہے بیٹا ـــــ تو نے تو بھنگ کی ٹھنڈائی پی راکھی ہے۔ سکھو رام جی کی طبیعت کیسی ہے، آج چوپال پہ نہ آئے..........''

''طبیعت تو تیری ٹھیک کروں گا جمیدار کے لال۔ حرام کھاؤ...... کبر بجو...... مردوں کا مانس کھا کھا کے جی رہا ہے۔''

چوکھے لال کی پگڑی ڈھیلی پڑ گئی اور شاید آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔ امی چند نے پگڑی کھینچ لی اور گھما کر پیٹ پر کس کے لات جما دی۔

''آ آہ ـــ''

چوکھے لال کے منہ سے چیخ نکلنے بھی نہ پائی کہ امی چند کا بھر پور مُکا ان کے پوپلے منہ پر پڑا۔ وہ نشے میں دھت ان کی دھوتی پکڑ کر کھینچے جا رہا تھا۔

''چل کھوسٹ، ابھی ٹیوویل کھول اور پھاوڑا نکال کے میرے کھیت میں پانی لگا۔''

ٹیوب ویل چل رہا ہے۔ چوکھے لال اس کے کھیت میں پانی لگا رہے ہیں۔ پورا گاؤں چوپال پر رانی بائی کے ناچ میں مگن ہے اور امی چند کھیت کی مینڈ پر بیٹھا نشے کی ترنگ میں ملھار گا رہا ہے۔ ہر طرف سوکھا ہے مگر امی چند کے کھیت میں ورشا ہو رہی ہے۔ کبھی وہ ملھار گاتا، کبھی ساون، کبھی کجری۔ وہ گاتا رہا اور صبح ہو گئی۔ سورج کی روشنی میں تیزی آتی جا رہی تھی اور امی چند کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

'چوکھے لال یہ بات پنچایت میں لے جائیں گے یا پولیس میں رپٹ لکھائیں گے۔'

اس نے سوچا اور کانپ گیا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دن میں ان کے سامنے سے کئی چکر لگائے اور شام کو تھوڑی دیر کے لیے چکی پر جا کر بیٹھ گیا۔ چوکھے لال کچھ نہیں بولے تو اسے یقین ہو گیا کہ شاید بے عزتی کے ڈر سے بات کو دبا گئے ہیں۔ مگر عزت کی انہیں کیا فکر، ہمت ہی نہیں ہے۔ دو ہی لاتوں میں ٹھیک ہو گئے نا۔ لاتوں کے بھوت ـــــ

فصل پک کر تیار ہو گئی تھی۔ کسانوں نے اپنے اپنے لانک چوکھے لال کے

تھریشر پر لگا دیے تھے۔ اندر بھگوان کو خوش کرنے کے لیے ناچ بھی ہوا، دان پن بھی ہوئے اور رات بھر ننگی عورتوں نے کھیتوں میں ہل بھی چلائے مگر اندر بھگوان نے ایک نہ سنی، دو چار بار بوندیں آئیں بھی تو نہ آنے کے برابر۔ اب اندر دیوتا کو خیال آیا ہے جب فصل کٹ چکی ہے—

آکاش پر بادل منڈلا رہے ہیں۔ کبھی کبھار بوندوں کی بوچھار بھی ہو جاتی ہے۔ مگر اس سمے ورشا ہوئی تو سب ناج کالا پڑ جائے گا، سب سڑ جائے گا، چار دانے بھی نہیں ملیں گے۔ پورا گاؤں بھوکوں مر جائے گا۔ ویسے بھی دو آنے بھر پیداوار ہوئی ہے اس سال۔ اور پھر امی چند کے کھیت کو تو ایک ہی پانی ملا تھا۔ بہت خوشامد کی چوکھے لال کی مگر دوسرا پانی دے کر نہیں دیا۔ ہیلپری میں اوپر کا خرچ بھی نہیں چلتا۔ اس پر بوڑھی ماں ...... بابا کی دوا دارو اور پڑیا ...... فصل کی درگت دیکھ کر اس کے باپو بیرم پور کے ٹھاکروں میں سگائی کی بات کرنے لگے ہیں—

امی چند نے ناج نکلوانے کے لیے صاحب سے آٹھ دن کی چھٹی لی ہے۔ صاحب کہنے لگے۔ ٹیمپریری ہو کر چھٹی؟ مگر صاحب بڑے دیالو ہیں آخر مان ہی گئے۔ جب چوکھے لال کو پتا چلا کہ امی چند کی چھٹی ختم ہو گئی ہے اور نویں دن بھی ڈیوٹی پر نہیں گیا تو انہوں نے بھولا اور اس کے لڑکے کو اپنی جیب سے کچھ روپے دے کر پاور ہاؤس بھیج دیا۔ اب بھولا کا لڑکا روزانہ پاور ہاؤس جاتا ہے۔ امی چند کی ہمیشہ کی لیے چھٹی ہو گئی ہے۔ بھولا کا لڑکا گاؤں بھر میں کہتا پھرتا ہے۔

"صاحب بڑے دیالو ہیں، امی چند کی جگہ مجھے مل گئی۔"

ریڈیو پر موسم کا حال— کسان بھائیوں کے لیے چیتاونی ہے، پچھلے برس سوکھے کے کارن اس سال جلدی اور ادھک ورشا کی سمبھاونا ہے۔ اگلے پکھواڑے سے کئی دنوں تک لگاتار بارش ہو سکتی ہے۔ کسان بھائیوں کو چاہیے، جلدی جلدی ناج نکال لیں—'

بادلوں کی گڑگڑاہٹ ...... بجلی بھی چمک رہی ہے۔ امی چند اسارے سے نکل کر چوکھے لال کی چکی کی طرف چل دیا۔

"میں کب سے کھوسامد کر رہا ہوں۔ کل کل کر کے اتنے دن لگا دیے۔ بھروسے پر رکھا، میری تو نوکری بھی جاتی رہی۔ نگلیا سے لانک میرے بعد آیا وہ بھی نکال دیا۔ دو بار بارش ہو چکی ہے، اب پھر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اب کی میرے گیہوں نکال دو، بڑی دیا ہو گی۔"

"تیرو لانک تو ابھی گیلو ہے۔ میری تو مسین ہی کھراب ہے جائے گی۔ تنک پھر پر اتو

ہونے دے......اور موئے سکھو رام سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔"

"کیا بات؟ مجھے بتاؤ، میں کہہ دوں گا۔"

"بات تو کچھو نہ ہے، پر اِتو کہنو ہے کہ اب سکھو رام تو بہت بُڑھیا گئے ہیں، ان کی بس کی تو کھیتی باڑی رہی نہ ہے، اور تو سے تو ہل چلانو بھی نہ آئے ہے۔ یاں ایرو گیروں کی مجوری کر یگو پھر بھی سکھو رام کی دوادارو کی پورتی نہ ہے سکے گی۔ نوکری لگی سو وہ بھی چھوٹ گئی۔ اب تو یائی میں بھلائی ہے کہ سہر جا کے چھوٹی موٹی نوکری کی پھکر کر۔ اور سکھو رام اگر کھیت گروی رکھنو چاہیں تو میں تیار ہوں —— کرج تو لینو ہی پڑے گو۔ میرے موکے کی جمین ہے۔ دیوان جی سے کاگج بھی تیار کروالیو ہے۔ بس سکھو رام کے انگوٹھا لگانے کی دیر ہے ——"

چوکھے لال نے بنڈی کی جیب سے کاغذ نکال کر دکھایا۔ امی چند کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی جیسے ان میں دھواں بھر گیا ہو۔ دھندلے دھندلے منظر ابھرنے لگے۔

'اس کے بابا کھیت میں پانی لگا رہے ہیں۔ وسنا رہٹ چلا رہا ہے۔ چھدّا نے بیلوں کو سانی لگا دی ہے۔ گھیر کے آگے بھوسے کی بُرجیاں بندھی ہیں۔ وہ پُپیا کے ساتھ کھیلتے کھیلتے ایک کھلی ہوئی برجی میں گھس گیا ہے۔ پُپیا اب کتنی بڑی ہوگئی ہے۔ کہہ رہی تھی، اگر تو نے جلدی بیاہ نہ کیا تو باپو کسی اور سے.........."

وہ غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چوکھے لال جی پہلے گیہوں نکال دو پھر بات کریو۔ ایسی کیا جلدی ہے ؟"

"گیہوں؟ گیہوں کیسے نکل سکے ہیں ابھی —— ابھی تو تیرو لانک گیلو ہے۔"

امی چند سے ضبط نہ ہو سکا۔

"چوکھے لال جی، میرا لانک اتنا گیلا نہیں ہے، تم نے اس سے بھی گیلے لانک نکالے ہیں۔ کل میرے گیہوں نکل جائیں ورنہ.........."

"کل؟ جے کیسے ہے سکے ہے.......... اگر اِتو ہی گُسے باج ہے تو کھیتی چوں کرے ہے۔ گھر میں بیٹھ کر راج کر راج ——"

"راج تو تم کرتے ہو چوکھے لال جی، حرام کا مال کھا کھا کے ——"

"دیکھ منہ سنبھال کے بات کر۔ باپ دادن کی بھیک مانگتے گجری، پوت چلے

منہ جوری کرنے ——"

"حرام کھاؤ.........لاتوں کے بھوت ——"

چوکھے لال کے پیٹ پر لات پڑی ہی تھی کہ امی چند پر بھولا، پچھمن اور دوسرے گاؤں والوں نے لاتوں اور گھونسوں کی بوچھار کردی۔ کسی نے گدالا اٹھا کر اس کے سر پر جما دیا۔ سر سے خون بہنے لگا اور وہ بے ہوش ہو کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ فوراً پنچایت بیٹھی۔ سکھو رام کے گھر کا حقہ پانی بند، لین دین بند اور سب پنچوں کی گواہی سے امی چند کو پولیس میں دینے کا فیصلہ۔

امی چند ابھی تک بے ہوش پڑا ہے۔ وِسنا اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا ہے۔ کچھ کچھ ہوش آیا تو اسے لگا کہ ایک ٹریکٹر اس کے سامنے کھڑا ہے جیسے سینے پر سوار ہو۔ دل ہلا دینے والی تیز گڑگڑاہٹ، محسوس ہوا ٹریکٹر اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ وہ بھاگنا چاہتا ہے مگر اس کے پیر شل ہو گئے ہیں۔ ٹریکٹر کا بھاری پہیا ٹانگوں کو کچلتا ہوا نکل جاتا ہے۔ تھریشر کا پٹا تیزی سے گھوم رہا ہے۔ اس کی قمیص پٹے میں آ گئی ہے۔ اس کا پورا ہاتھ پٹے میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتا ہے مگر چٹاخ سے اس کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا ہے اور وہ پانی کی تلاش میں چاروں طرف بھاگ رہا ہے۔ چوکھے لال کا ٹیوب ویل.........! وہ کنڈی میں پانی پینے کے لیے جھکتا ہے مگر پانی میں بجلی کا کرنٹ دوڑ رہا ہے، وہ اچھل کر الگ ہٹ جانا چاہتا ہے کہ کسی نے اس کی گردن پانی میں ڈبو دی۔ وہ اپنا منہ پانی سے نکالنے کی کوشش میں پھڑ پھڑا رہا ہے مگر ناکام ہے ......داروغہ جی کی گرفت ہے ہی اتنی مضبوط۔

وِسنا نے پھر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس نے پلکیں پھڑ پھڑا کر آنکھیں کھولیں اور اپنے پورے جسم پر نظر ڈالی۔

'سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہاتھ، پیر.........اور داروغہ جی؟ وہ بھی نہیں ہیں۔ تو کیا کچھ بھی نہیں ہوا؟'

اس نے اطمینان کی سانس لی۔

'ہوا کیوں نہیں، بہت کچھ تو ہو گیا۔'

اس نے دیکھا کہ تھریشر کے پاس اس کے بابا ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں، ان کی پگڑی چوکھے لال کے پیروں میں رکھی ہے اور چوکھے لال کے ہاتھ میں دیوان جی سے لکھوایا ہوا کاغذ ہے، جس پر بابا نے انگوٹھا لگا دیا ہے۔ اسے لگا کہ آنکھوں کے سامنے مکڑی نے ایک

جالا بُن دیا ہے۔ جالے کے تار بجلی کے تاروں کی طرح ہیں۔ مکڑی کے منہ سے لعاب اس طرح نکل رہا ہے جیسے ٹیوب ویل سے پانی کی دھار نکلتی ہے اور مکڑی اتنی تیزی سے جال بن رہی ہے جیسے زمین کے سینے پر ٹریکٹر دندناتا ہوا اِدھر اُدھر گھوم رہا ہو۔ اس کے بابا جالے کے اُدھر ڈرے سہمے بیٹھے ہیں۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھریشر کا پٹا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اس کے اپنے لائنگ میں لگا لگ چکا ہے۔ وِسنا مونٹھے بنا بنا کر تھریشر میں لگا رہا ہے اور سنہری سنہری دانے تھریشر کے نیچے جہاں اس کے بابا کی رنگی ہوئی پگڑی رکھی ہے جمع ہوتے جا رہے ہیں......!!

○○○

تین سال

علی جان کو اپنے ماتھے پر بندھے سہرے کی لڑیاں لوہے کی زنجیروں سے بھی زیادہ وزنی اور خوفناک لگ رہی تھیں۔ وہ پھولوں میں منہ چھپائے کچھ اس طرح سہما ہوا بیٹھا تھا جیسے چڑیا کا بچہ سر پر باز کو اڑتے دیکھ کر سہم جاتا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا مجید اپنے ساتھ گاؤں کے پردھان، داروغہ جی اور کچھ سپاہیوں کو لے کر اس کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں تو وہ کانپ اٹھا۔

''ارے میرا لال............علی جان............میرا بچہ............''

ماں کی چیخ اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی اور پھر آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

منہ پر پانی کی چھینٹیں پڑتے ہی اس نے آنکھیں پھڑ پھڑائیں اور گردن گھما کر دیکھا۔ بیگم مرزا سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھیں۔ مرزا مجید اس کے اوپر جھکے کھڑے تھے

اور کہہ رہے تھے۔

"بیٹے آنکھیں کھولو.........شاباش۔"

پھر اس کی کلائی پکڑ کر بخار دیکھنے لگے۔ بیگم بولیں۔

"اتنا محنتی بچہ ہے، ذرا کام بتادو پھر دیکھو، دھوپ ہو یا بارش، کام پورا کر کے ہی دم لیتا ہے۔اب دیکھو نا لکڑی اور پرڈالنے کے لیے کہا تھا، دن بھر اسی میں لگا رہا۔لو لگ گئی نا آخر۔"

علی جان نے غنودگی کے عالم میں تھوڑی سی آنکھیں کھولیں اور دالان کی چھت کو گھورنے لگا مگر اسے چھت نظر ہی نہ آئی۔

محسوس ہوا کہ دور تک آسمان پھیلا ہوا ہے اور سفید بادل کے ٹکڑے اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔

بادل ؟

نہیں یہ تو کاغذ کے ٹکڑے ہیں۔ تاگے سے بندھے کاغذ کے ٹکڑے...... ہاتھ سے بنائی پتنگیں۔اور تاگے؟......... مرزا مجید کے لحاف گدّوں سے نکالے ہوئے تاگے۔

ایک روز جب بیگم مرزا نے لحاف گدّے دھوپ میں ڈالنے کے لیے ٹانڈ سے اتارے تو ان میں ڈورے غائب تھے۔مرزا نے علی جان کو ڈانٹا مگر بیگم فوراً ہی بول پڑیں۔

"کیا ہوا اگر ڈورے نکال لیے۔ بچہ ہی تو ہے۔ ویسے بھی سردیوں میں روئی بدلوانی ہے۔"

بہت دیر تک پتنگیں اڑتی رہیں، پھر اسے لگا کہ ساری پتنگیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں اور سیاہ ہوتی جا رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد وہاں ایک بھی پتنگ نہیں تھی۔اس کی نظروں کے سامنے کڑیوں سے پٹی مرزا مجید کے دالان کی چھت تھی جسے وہ گھورے جا رہا تھا۔آہستہ آہستہ اس کی نگاہیں دالان کی چھت سے سرکتی ہوئی بڑے سے آنگن میں رینگنے لگیں۔ایک کونے میں چوکی پر بیٹھی بیگم مرزا دوپٹے پر سچے گوٹے کی گوٹ ٹانک رہی ہیں۔اسے سچا گوٹا کتنا اچھا لگتا ہے۔وہ اکثر بیگم مرزا کی تلے دانی سے گوٹا نکال کر کرتے کے دامن پر رکھ کر بار بار دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔بیگم مرزا ایسا کرتے دیکھ لیتی ہیں تو بھی کچھ نہیں کہتیں۔کہیں بھی کیسے، اسے تو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر اولاد سے محروم ہیں۔علی جان

سچے گوٹے کو کلائی سے لپیٹ لیتا ہے اور اپنے ہاتھ میں ہتھکڑی ....!

داروغہ جی نے اس کے ہاتھ میں بندھی رسی کو جھٹکا دے کر کھینچا اور رسی سپاہی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے۔

''اے رام داس، اس حرام زادے کو چوکی لے کر چل۔ میں مرزا جی کے ساتھ آتا ہوں ——''

مرزا جی کا گھرانا گاؤں کا معزز گھرانا تھا۔ ان کا مکان گاؤں کے دوسرے گھروں کے مقابلے میں بڑا اور خوبصورت تھا۔ آنگن اور برآمدے کے فرش اور زینے کے علاوہ بیت الخلاء کے قدمچے بھی پکی اینٹوں کے بنے تھے۔ باقی پورا مکان کچی اینٹوں کی چوڑی چوڑی دیواروں پر قائم تھا۔ کچی اینٹوں پر چکنی مٹی کا لیپ اور اس پر چونے کی پُتائی، یوں محسوس ہوتا جیسے مٹی کے ڈھیلوں کے بیچ چاندی کا کٹورا پڑا ہو۔ بالائی منزل پر دو بڑے بڑے کمرے تھے، جن کے سامنے والی چھتیں بھوسے کی گوڑی ملی چکنی مٹی سے لپی ہوتیں۔ مرزا صاحب کی جائیداد کا کافی حصہ بک گیا تھا۔ اب ان کی آمدنی کا ذریعہ کچھ زمین تھی، جو بٹائی پر دے رکھی تھی اور ایک آم کا باغ تھا، جس سے سال بھر کی ضروریات پوری ہو جاتیں۔ اولاد کوئی تھی نہیں، محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانے میں بیگم مرزا کا دن کٹ جاتا۔ علی جان بھی ان سے قرآن پڑھنے آیا کرتا۔ اس کا باپ رسول خاں میواتی، علاقے کا نامی ڈکیت تھا، جو کئی سال سے جیل میں ایک قتل کی سزا کاٹ رہا تھا۔ علی جان کا گھر مرزا مجید کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ اس کی ماں کھجور کے پتوں کی چنگیریاں اور پنکھے بنا کر گھر کا خرچ چلا لیتیں۔ بیگم مرزا بھی علی جان کے گھر کا پورا خیال رکھتیں۔ علی جان لڑائی جھگڑے، چوری چکاری سے دور بھاگتا تھا۔ اس کا دل پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ مائل تھا۔ کئی سپارے شوق سے ختم کر چکا تھا۔ جس دن رسول خاں کی سزا پوری ہوئی اور وہ رہا ہو کر گھر لوٹا تو اس نے علی جان کو پڑھنے سے اٹھا لیا۔

''بزدل بنے گا کیا؟ ان مرزاؤں کی صحبت نے تجھے کسی دین کا نہیں چھوڑا۔ بہادری سے جی ..... عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر کوئی میواتی جیا ہے کبھی؟ اور تو ہے کہ میری ناک کٹوانے پر تلا ہے..... حرام زادے۔''

علی جان لرز گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اب رسول خاں اکیلا نہیں،

کئی لوگوں کے درمیان کھڑا نظر آیا۔ پھر علی جان کو لگا کہ رسول خاں کے گروہ کے آدمی اسے زبردستی پکڑ کر جنگل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ بادل گرجتے ہیں تو اس کی رگوں میں خون جم جاتا ہے۔ اچانک ایک گڈھے میں اس کا پیر پڑ گیا، وہ چیخنے لگا۔

"نہیں......... نہیں......... مجھے چھوڑ دو۔"

کالے خاں نے اس کی گدی پر ایک مُکا جمایا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ رسول خاں کی کڑک آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"سیدھا چل نامراد......... بہت عیش کی کاٹ لی۔"

وہ گرتا پڑتا آگے بڑھا۔ چاروں طرف گھور اندھیرا تھا۔ اس نے دیکھا سفید سفید کپڑے پہنے کئی آدمی ایک کھیت میں لیٹے ہوئے ہیں۔ رسول خاں کے ساتھی کالے خاں نے اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑا دے دیا۔

"یہ لے......... اور ان سب کو ایک طرف سے ختم کر دے۔"

"ایں!......... نہیں........."

"نہیں کے بچے........."

رسول خاں نے دونوں ہاتھوں سے بال پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیا اور گھسیٹنے لگا، اور ان سفید پوش انسانوں کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ مرزا مجید...... ایک نہیں بہت سے مرزا مجید سفید کپڑے پہنے کھیت میں لیٹے ہوئے تھے۔

"نہیں بابا......... میں مرجاؤں گا ——— نہیں........."

وہ زور سے چیخا۔ اسے محسوس ہوا کہ گلے کی ساری نسیں پھٹ گئی ہیں اور اس کی چیخ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ وہ چیختا ہی رہا بہت دیر تک، اور پھر رسول خاں نے اسے زور سے جھنجھوڑ دیا۔ خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا اور رسول خاں کی آواز کانوں میں پڑی۔

"کیوں مرا جا رہا ہے......... اُٹھ ———"

علی جان کی ماں کھڑی رو رہی تھیں۔ رسول خاں نے لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو شک ہے کہ اس کی رگوں میں میرا ہی خون ہے یا کسی اور کا ———"

پھر رسول خاں اپنے ماتھے کو پکڑتے ہوئے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا، جیسے سارے جتن بیکار چلے گئے ہوں اور بولا۔

''اچھا تو ایسا کر —— کل سے ابراہیم لوہار کے یہاں کام کرنے جایا کر۔ وہ کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہتھوڑا پیٹنے کو ایک لڑکے کی ضرورت ہے۔''

گرمی بہت ہے۔ علی جان کے پورے بدن سے پسینے کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ ابراہیم لوہار کے ٹھیے پر ہتھوڑے کی چوٹیں مارتے مارتے دونوں بازو سُن ہو گئے ہیں۔

پسینا خشک ہو رہا ہے۔ بیگم مرزا کو پسینا آتا بھی بہت ہے۔ وہ ان کے سرہانے بیٹھا پنکھا جھل رہا ہے۔ بیگم نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

''سوتا کیوں نہیں علی جان .... جابر آمدے میں سو جا۔ اچھا لے یہ کنگن اور ہار لے جا کر تحویل میں رکھ دے۔ کم بخت گرمی میں زیور پہننا بھی عذاب ہے۔''

چابی کا گچھا اور زیور علی جان کے حوالے کر کے بیگم نے آنکھیں بند کر لیں۔ علی جان نے تجوری میں کنگن اور ہار رکھ کر چابیاں بیگم کے تکیے کے نیچے رکھ دیں۔

''تو نے سنڈاسی کہاں رکھی علی جان؟''

''آپ کے سرہانے ——''

''ایں.........؟''

ابراہیم لوہار چونک پڑا۔

ایک ڈکیتی کے جرم میں رسول خاں کو پھر تین سال کی سزا ہو گئی۔ علی جان کو موقع مل گیا۔ اس نے لوہار کو سلام کیا اور مرزا کے گھر آن پہنچا۔ دالان کے در سے چپٹ کر کھڑا ہو گیا اور انگلیوں پر کچھ حساب لگانے لگا۔

''تین سال.........یعنی چھتیس مہینے ——''

پھر خوش ہو کر بیگم مرزا سے پوچھنے لگا۔

''چاچی کیا تین سال میں قرآن ختم ہو جائے گا؟''

''کیوں نہیں بیٹا.........تم محنت سے پڑھو گے تو دو سال ہی میں.........''

وہ اچھلنے لگا اور پھر اچھلتے اچھلتے اس کے پاؤں اس ڈھب سے پڑنے لگے جیسے

مجذوب کو حال آ گیا ہو۔

''دو سال میں قرآن مجید ختم۔ بچا ایک سال .... ایک سال میں تو کئی بار دہرا کر پکا کر لوں گا ——''

سپاہی نے اس کے ہاتھ میں بندھی رسی کو زور سے کھینچا۔

''تیز تیز چل .... یہ اونگھ کیوں رہا ہے؟''

اس کا حلق بالکل خشک ہے، بہت زور کی پیاس لگی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ دھوپ مرزا کے صحن کی دیوار میں بنی گھڑونچی سے ہو کر منڈیر تک پہنچ گئی ہے۔ علی جان بالٹی میں پانی بھر کر چھت پر چڑھ گیا ہے۔ دن بھر کی تپتی ہوئی چھت پر جب چھڑکاؤ کیا تو مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹنے لگی۔ زمین کی تپش کم ہوئی تو اس نے کمرے سے دو پلنگ نکال کر بچھا دیے اور وہیں ایک چارپائی پر لیٹ کر اس طرح کروٹیں لیتا رہا جیسے وہ نہیں، مرزا مجید لیٹے ہوں۔ کچھ دیر بعد نیچے اتر کر گھڑونچی سے ایک گھڑا اٹھا لایا اور اس پر پیتل کا کٹورا ڈھک کر چھت پر رکھ دیا۔ چھت کی قد آدم منڈیریں بارش سے ڈھل ڈھل کر بالکل ختم ہو چکی تھیں اور محلے کی تمام چھتیں مل کر ایک میدان سا بن گیا تھا۔ مرزا اور بیگم گرمیوں میں چھت پر سوتے تھے۔ گاؤں میں چوپالیں اور بڑے بڑے میدان ہونے کی وجہ سے چھت پر سونے کا رواج نہیں تھا، اس لیے محلے کی دوسری چھتیں سونی پڑی رہتیں، بات کچھ بھی ہو مرزا منڈیریں اونچی نہ کرانے کی یہی وجہ بتاتے——

سورج غروب ہونے کے بعد بیگم روٹی ہنڈیا لے کر چھت پر ہی آیا جا کرتیں۔ محلے کی تمام عورتیں اپنی اپنی چھتوں سے ہو کر بیگم مرزا کے پاس آ بیٹھتیں۔ بیگم ان کی خاطر داری پان سے کیا کرتیں۔ عورتیں پان چپڑ چپڑ چبا کر وہیں پیکوں کے ڈھیر کر دیتیں اور علی جان چپ چاپ منڈیر پر بیٹھا پیکوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا۔ جیسے ہی مرزا دروازے کی کنڈی بجاتے وہ بھاگ کر کواڑ کھول دیتا۔ تمام عورتیں چلی جاتیں۔ مرزا اوپر ہی کھانا کھاتے اور کھانے سے فارغ ہو کر خبریں سنا کرتے۔ علی جان بھی منڈیر پر بیٹھا غور سے ریڈیو سنتا اور اس طرح سر ہلاتا جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ اچانک بیگم مرزا کی آواز اسے چونکا دیتی۔

''جاؤ بیٹا، بہت رات ہو گئی ہے۔ تمہاری اماں راہ دیکھ رہی ہوں گی۔''

اور علی جان بسم اللہ کی چھت سے اتر کر چلا جاتا۔ لیکن صبح مرزا اور بیگم کے اٹھنے سے پہلے ہی بیلے کے پھول باغ سے توڑ کر لے آتا اور ہار بنا کر گھڑوں کی گردنوں میں پہنا دیتا۔ کچھ پھولوں کے گجرے بنا کر بیگم کے لیے رکھ دیتا۔ بیگم اٹھتیں تو کانوں میں گجرے پہن لیتیں ۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

''تیز تیز چل ——'' سپاہی نے پھر علی جان کے ہاتھ میں بندھی رسی کو زور سے کھینچا۔ علی جان جیسے کھنچتا ہی جا رہا ہے۔ اس کی عمر تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اب وہ انیس سال سے اوپر نکل چکا ہے۔ اس کے باپ کو گزرے کئی سال ہوگئے ہیں ۔ ماں سمجھاتے سمجھاتے گونگی ہوتی جا رہی ہیں۔

''اب تو کہیں جا کر کما نگوڑے .... اب تو جوان ہوگیا ہے۔ مرزا جی کے پاس بھی اتنا کہاں ہے کہ تیرے لیے کچھ کرسکیں ۔ تو ہے کہ ہٹا کٹا پھرے ہے۔ کمانے کے نام پر ڈھیر۔ میٹے میواتیوں میں شادی بیاہ کا الٹا ہی رواج ہے۔ لڑکے والے کو پیسے دینے پڑے ہیں لڑکی بیاہ کرلانے کے لیے۔ میرے پاس کہاں روکڑ دھری ہے جو گونا کرلاؤں گی۔ تیرے بابا تو چھوٹے خاں کی لونڈیا کے سنگ سگائی کرکے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مجھے طعنے سننے پڑے ہیں۔ دو دو کوڑی کی لگائیاں کہتی پھرے ہیں کہ 'لگے ہے سگائی توڑنی پڑے گی' .... اور تیرے کان پہ جوں تک نہ رینگے ہے۔''

اس کی ماں بڑبڑاتی رہیں اور وہ اٹھ کر چل دیا مگر اب محسوس کرنے لگا تھا کہ ماں کی باتیں ہر وقت اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ اسے اپنے اندر ایک انجانی سی کھلبلی کا احساس ہوا۔

مریم، چھوٹے خاں کی بیٹی مریم .... اور ایک موٹی رقم کی مانگ ——

جب اس کے چھوٹے چچیرے بھائی کی شادی ہوئی تو لگا کہ مریم اس کے دل میں اِدھر سے اُدھر بار بار کروٹ بدل رہی ہے۔ دل بیٹھنے لگا۔ مریم .... عورتوں کے طعنے .... شادی .... مگر روپیہ .... ؟ اس کی گانٹھ میں تو دو روپلی بھی نہیں تھیں۔

جاڑوں کی سیاہ رات تھی۔ وہ گاڑھے کی رضائی میں سر چھپائے سو رہا تھا۔ چچیرے بھائی کے بستر سے اُبھرنے والی کھسر پھسر کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کان لگا کر میاں بیوی کی باتیں سننے لگا۔ اسے اپنے جسم کے ہر حصے میں ان کی باتیں جذب ہوتی محسوس

ہوئیں۔ کھسر پھسر کی آوازیں تیز ہو گئیں۔

مریم ———!

اسے بار بار لگتا کہ مریم دلہن بنی سامنے کھڑی ہے اور وہ سینہ تانے اس کی طرف بڑھ رہا ہے مگر اچانک اس کے کندھے جھک جاتے ہیں جیسے کسی نے روپیوں کی گٹھری اس کے کندھوں پر لاد دی ہو۔ وہ پھر کان لگا کر کوٹھری میں گونجتی آواز سننے لگتا ہے۔ رضائی کے اندر اس کا دم گھٹنے لگا تو منہ سے رضائی ہٹا کر پھینک دی۔ کوٹھری میں سرسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھائی اور ٹاٹ کے پھٹے پردے سے جھانک کر اپنے چچیرے بھائی کے بستر کی طرف دیکھا۔ اس کی جورو اس سے چمٹی ہوئی لیٹی تھی اور اپنی بھاری بھرکم ران اس کے پیٹ کے اوپر رکھے ہوئے تھی۔ علی جان نے منہ ڈھانپ لیا اور اپنی ہونے والی جورو مریم کا تصور کیے رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ خدا خدا کر کے جاڑوں کی رُت بیت گئی اور کھسر پھسر کی آوازوں سے چھٹکارا مل گیا۔ اب وہ اپنی کھاٹ آنگن میں بچھا کر سوتا۔

آج علی جان کے دل کی طرح موسم میں بھی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ اندھیری رات اور اس پر بادل کی گرج کے ساتھ بجلی کی چمک۔ علی جان کے جسم میں بھی بجلی چمک رہی ہے اور بار بار اسے اپنے اندر گرج سی محسوس ہوتی ہے۔ بدن سلگ رہا ہے، بادل گرج رہے ہیں اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ جب علی جان بارش میں بھیگ گیا اور جاڑے سے کپکپانے لگا تو اس نے کھاٹ چھپر کے نیچے کھینچ لی۔ چھپر میں لٹکی لالٹین سے بدن سینکنے لگا لیکن لالٹین اس کے جسم کو گرم نہ کر سکی، اسے تو مریم کی گرمی چاہیے تھی اور مریم کو پانے کے لیے جیب کی گرمی ——— وہ رات بھر چھپر کی تھنکیا سے لگا کانپتا رہا اور چھپر کے پھٹنے کی دعا مانگتا رہا۔

علی جان کے سر سے سہرے کی لڑیاں ٹوٹ کر زمین پر گر پڑی تھیں۔ چاروں طرف بہت سے لوگ جمع تھے جو سیاہی کو روکے کھڑے تھے اور اس سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا، لوگ جوتوں سے بیلے کے پھول مسلتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

بیلے کے پھول!

وہ حسب معمول بیلے کے پھولوں کے ہار گھڑوں کی گردنوں میں پہنا چکا تھا۔ مرزا ناشتے کے بعد باہر جانے ہی والے تھے کہ کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ علی جان بھاگ کر

دروازے پر جا پہنچا اور کواڑ کھول دیے۔

''کون نھو چاچا؟ اچھا آم لے کے آئے ہیں۔''

نھو رام نے آموں سے بھرا پٹھو نیچے رکھا اور جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''مرزا جی گھر میں ہیں؟ باغ کے پیسے دینے ہیں۔''

مرزا مجید نے آواز دی۔

''کون ہے؟ علی جان اندر بلا لو۔''

نھو رام اندر آگئے اور مرزا کے ہاتھ میں سو سو کے نوٹوں کی گڈی تھما کر بولے۔

''یہ لو مرزا جی بیعانہ کاٹ کر باقی کے۔ اب حساب بے باق۔''

نھو ٹھیکے دار اٹھ کر چلے گئے۔ مرزا مجید کے ہاتھ میں روپیوں کی گڈی ہے۔ علی جان کو لگا کہ مرزا مجید کے پیچھے کہیں مریم چھپی ہے۔ وہ بار بار ان کی طرف اچٹتی سی نظر ڈالتا مگر اس کی نظر بری طرح کانپنے لگتی۔ مرزا مجید نوٹوں کی گڈی بیگم کو تھما کر باہر چلے گئے۔ بیگم نے نوٹ گنے اور ازار بند سے چابی کا گچھا کھول کر علی جان کو دیتے ہوئے کہا۔

''لو بیٹے چابی لو اور روپے تحویل میں رکھ دو۔ سنبھال کے رکھنا پورے سال کا خرچہ ہے۔''

علی جان نے گڈی کو مُٹھی کی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ چابیاں لے کر تجوری کی طرف بھاری بھاری قدموں کو ڈھکیلتا ہوا بڑھا لیکن اس کے قدم مرزا کے گھر کی دیواروں کو پھلانگ جانا چاہتے تھے۔ اس نے تجوری کے تالے میں بڑی سی چابی گھمائی لیکن چابی تالے میں نہیں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھی۔ اب اس کے ذہن کے وہ کواڑ کھل گئے جو پیدائش سے اب تک بند تھے۔ وہ ذہن پر جمی میل کی اس پرت کو کھرچ کر پھینک دینا چاہتا تھا جسے آج تک ایمانداری اور وفاداری کا مقدس دوشالہ سمجھتا آیا تھا۔ تجوری کے دونوں پٹ کھل گئے۔ وہ بھی اس کی جیب کی طرح خالی تھی۔ وہ نوٹوں کی گڈی کو اس میں رکھتے رکھتے رک گیا کہ اسے چھوٹے خاں کی پھیلی ہوئی جھولی نظر آرہی تھی۔ وہ جھولی، جو اس سے نوٹوں کی شکل میں اس کی وفاداری اور ایمانداری کے خون کی بھیک مانگ رہی تھی۔

چھوٹے خاں کی بہو کے طعنے —— اس کی بوڑھی ماں کی عزت —— چچیرے بھائی

کی جورو کی بھاری بھر کم ران..........

''کیا وہ نوٹوں کی گڈی چھوٹے خاں کی جھولی میں ڈال دے؟''

اس نے جلدی سے گڈی کو اپنے تہہ بند میں اڑس لیا۔

''بیٹے یہ لو...... سنبھال کے رکھنا، پورے سال کا خرچہ ہے۔''

اسے لگا کہ تہہ بند کی گانٹھ ہولے ہولے کھلتی جا رہی ہے۔ وہ گانٹھ کسنا چاہتا تھا کہ بیگم کی آواز کانوں میں گونجی۔

''یہ لے بیٹا........ میں نے تیرے لیے کرتہ سی دیا ہے۔ اور باہر چھینکے پر کھیر رکھی ہے، اپنی اماں کے لیے لیتے جانا۔''

اچانک تہہ بند کی گانٹھ کھل گئی اور گڈی فرش پر گر پڑی۔ گڈی کی ہلکی مگر خوفناک آواز نے اس کے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا۔ جھک کر گڈی اٹھائی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کمرے کی دیوار پر لگی مرزا کی تصویر اسے گھور رہی تھی۔ وہ تصویر سے آنکھیں نہ ملا سکا اور سہم گیا۔ نوٹوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر غور سے دیکھنے لگا۔ نوٹوں سے ہٹ کر اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی۔ اپنے ہاتھ کالے نظر آئے۔ آنکھیں بند کیں تو مریم کے ہاتھ پیلے دکھائی دیے۔ آنکھیں کھولتا تو کالا اور بند کرتا تو پیلا رنگ اس کے وجود میں اتر جاتا۔ جب اپنے ہاتھ کالے نظر آتے تو نگاہیں تجوری کی جانب اٹھ جاتیں، مگر جب مریم کے ہاتھ پیلے ہونے لگتے تو اسے تہہ بند کی گانٹھ ہی دکھائی دیتی۔ کبھی پیلے تو کبھی کالے ہاتھوں کو دیکھتے دیکھتے اس نے پھر ایک بار مرزا کی تصویر دیکھی۔ اب اسے ان آنکھوں میں اپنے مرحوم باپ کی تصویر نظر آ رہی تھی، جو اس سے بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ علی جان نے ہمت کی اور تہہ بند میں نوٹوں کو رکھ کر مضبوطی سے انٹی کس لی اور چابی کا گچھا بیگم کو واپس کر کے چلا گیا۔ دوسرے دن مرزا نے پوچھا۔

''بیگم آج علی جان نہیں آیا، کیا بات ہے؟''

بیگم نے کہا۔

''آیا تھا، کچھ طبیعت خراب تھی، اس لیے چلا گیا۔''

کئی روز تک علی جان نہیں آیا۔ بیگم مرزا پریشان ہونے لگیں۔

''کہیں طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی؟''

وہ بسم اللہ کی چھت سے اتر کر علی جان کو دیکھنے گئیں۔ دیکھا کہ علی جان کے گھر میں کچھ لوگ جمع ہیں اور وہ دولھا بنا ہوا ہے۔ انہیں ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوا۔

''مگر مجھے مدعو کیوں نہیں کیا گیا.........؟ مجھے اطلاع تک نہیں اور یہاں...... آخر علی جان پر میرا بھی تو کچھ حق ہے۔''

انہیں لگا کہ ان کے سامنے چھوٹے چھوٹے بہت سے سانپ رینگ رہے ہیں۔

''مگر میواتیوں کے رواج کے مطابق شادی کے لیے لڑکے والوں کو ایک رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ راتوں رات علی جان کے ہاتھ یہ رقم کہاں سے لگ گئی؟''

اب ان کی آنکھوں کے سامنے بہت موٹا سا اژدہا منہ کھولے کھڑا تھا۔ پھر انہیں یاد آیا کہ کچھ دن پہلے باغ کے روپے علی جان کو تجوری میں رکھنے کے لیے دیے تھے، کہیں وہی تو نہیں..........؟

''نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ کبھی گھر کی ایک کیل بھی ادھر سے اُدھر نہیں کی۔ میں تو زیور، روپیہ پیسا، سب اسی سے رکھواتی تھی۔''

بیگم مرزا یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ علی جان کی نظر بھیڑ کو چیرتی ہوئی ان پر پڑی اور وہ چونک کر رہ گیا۔ اس نے سر پر بندھے سہرے سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اس کے چہرے پر تو پردہ پڑ گیا مگر بیگم مرزا کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ انہیں محسوس ہوا کہ آج وہ پھول، جو علی جان برسوں سے ان کے گھڑوں کی گردنوں میں پہناتا چلا آیا ہے، سمٹ کر اس کے سہرے کی لڑیوں میں آ گئے ہیں۔ وہ الٹے پاؤں گھر آئیں اور لگیں تجوری کھکھوڑنے۔ تجوری خالی تھی۔ ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اتنے میں مرزا جی بھی آ پہنچے۔

''کیا بات ہے بیگم، تم پریشان کیوں ہو؟''

بیگم نے تجوری بند کی اور کہا۔

''کچھ بھی تو نہیں.........''

مگر مرزا نے تجوری کو کھول کر دیکھا، وہ خالی تھی۔

سپاہی نے گاؤں کے لوگوں کو دھتکارا۔ ''بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے، چلو اپنا کام

کرو۔" اور علی جان کو دھکے مار مار کر اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ علی جان کی ماں پچھاڑیں کھاتی ہوئی آئیں اور بلک بلک کر رونے لگیں۔

"ارے میرے لال کو کہاں لے جا رہے ہو؟ اس نے کیا کیا ہے؟"

"یہ تو تب پتا چلے گا، جب تین سال جیل میں چکی پیسے گا، پورے تین سال ـــــ"

جب علی جان گلی میں مرزا مجید کے گھر کے سامنے سے گزرا تو بیگم مرزا کواڑ کی آڑ میں کھڑی جھانک رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ علی جان رک گیا اور اپنی خشک آنکھوں کو اس طرح پونچھنے لگا جیسے اپنی نہیں بیگم مرزا کی آنسو بھری آنکھیں پونچھ رہا ہو، اور پھر انگلیوں پر کچھ حساب لگانے لگا۔

"تین سال .... یعنی چھتیس مہینے ...."

بیگم مرزا نے کانپتا ہوا ہاتھ منہ پر رکھا اور دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

○○○

کوئی اور

دیوار پر لگے گھنٹے نے جب آدھی رات گزر جانے کا اعلان کیا تو اس نے پلکوں کو اس طرح پھڑ پھڑا کر آنکھیں کھولیں جیسے ان پر رکھے بھاری پتھروں کو ڈھکیلا ہو۔ پھر ٹکٹکی باندھے سائے نما دیوار کو گھورنے لگی۔ روزانہ کی طرح آج بھی اس کی کپکپاتی نظریں دیوار میں لرزش محسوس کر رہی تھیں۔

'دیوار کمزور کیوں ہے؟ یہ روزانہ کیوں ہلتی ہے؟ کیا یہ مضبوط نہیں ہو سکتی؟ کیا اسے توڑ دینا چاہیے؟ نہیں نہیں۔ اگر یہ ٹوٹ گئی تو گھر بے در و دیوار ہو جائے گا۔ سب کچھ ٹوٹ جائے گا.........اور اس طرح ٹوٹے گا کہ ملبے میں اینٹ کا ایک ٹکڑا بھی تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ ممکن ہے یہ ہلتی ہی نہ ہو، یہ میرا وہم ہو، یا احتیاط کی انتہا، محض میری نظریں ہی کپکپاتی ہوں'

اب اس کے ذہن میں سانپ سرسرانے لگے اور وجود میں خشک لہریں دوڑ گئیں۔

باہر کسی کے قدموں کی آہٹ ....

اس پر بجلی سی گر پڑی۔ پتا نہیں وہ بجلی تھی یا روشنی کی کرن۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی، ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر کے دروازہ کھولا۔ سنجے دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ابھی تک جاگ رہی ہو سُدھا؟'' اس نے رسماً سوال کیا۔

''بس یوں ہی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ کچن میں جا کر کھانا اتارنے لگی۔

''سدھا تم نے کھا لیا کھانا؟''

وہ چپ رہی۔

'سنجے جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی کھانا کھاتی ہے پھر بھی ....

اس نے نوالہ بنا کر مسکراتے ہوئے سنجے کے منہ میں رکھ دیا، پھر کچھ اس انداز سے تکنے لگی مانو انتظار کر رہی ہو کہ سنجے بھی اسے اپنے ہاتھ سے کھلائے گا۔ مگر سنجے نے جلدی جلدی تین چار نوالے لیے اور ''مجھے بھوک نہیں ہے'' کہہ کر بستر پر جا لیٹا۔ سدھا بھی لیمپ بجھا کر اس کے برابر لیٹ گئی اور پھر دیوار کو گھورنے لگی۔ اب تو دیوار کچھ زیادہ ہی ہل رہی تھی، اتنی زیادہ کہ اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں میں شدید درد ہونے لگا۔

'دیوار کچھ پیچھے کی طرف ہٹ رہی ہے ——— نہیں .... دیوار کو چاروں طرف سے دھند نے گھیر لیا ہے۔' اس نے محسوس کیا کہ ذہن سے ایک سانپ نکل کر دیوار پر چڑھ رہا ہے۔

'نہیں نہیں .... یہ سانپ نہیں ہے، یہ تو دراڑ ہے ——'

وہ کانپ گئی اور سنجے سے چپٹ کر رونے لگی۔

''سنجے تم اتنا کیوں بدلتے جا رہے ہو؟ شادی سے پہلے ہی میں نے تمہیں سب کچھ ....''

''نہیں سُدھا یہ بات نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ غلط سمجھ رہی ہو۔'' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اگر میں تمہارے قابل نہیں تھی تو ....''

''سدھا ایسا مت کہو .... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ایسی ہی تسلیوں کے سہارے تو وہ اب تک جی رہی تھی۔ سدھا کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں مگر بنجے کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں۔ اس نے کئی بار اٹھ کر سدھا کی آنکھوں کو چومنا چاہا مگر کوئی طاقت پیچھے کی طرف کھینچتی اور وہ بستر پر ڈھیر ہو جاتا۔

دفتر ——— فائلیں ——— ٹائپ رائٹرس ——— اور یہ ٹائپسٹ ....

'ارے اس نے تو آج ساڑی پہن رکھی ہے۔'

"ساڑی !"

سدھا اور اس کی معصوم فرمائش ———

"آپ دفتر سے کب لوٹیں گے؟"

"کیوں کوئی کام ہے کیا؟"

"کیا مجھے پوچھنے کا بھی حق نہیں ...... آپ کبھی کبھی دیر سے آتے ہیں نا......"

"تم تو ناراض ہوگئیں۔ کوئی ساڑھے چار بجے تک لوٹ آؤں گا۔"

سدھا نے التجا بھری نظروں سے دیکھا۔

"دیکھیے میں کب سے ایک ساڑی کے لیے کہہ رہی ہوں۔ مگر آپ روزانہ بھول جاتے ہیں۔"

پھر ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"آج ضرور لیتے آئیے گا۔ لائیے گا نا؟"

لہجے میں سمجھدار بچے کی سی ضد گھلی تھی۔

"مگر تمہارے پاس تو کئی ساڑیاں ہیں۔"

سُدھا کہنا چاہتی تھی کہ تم نہیں جانتے بنجے۔ بیوی شوہر کی لائی ہوئی چیز کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتی ہے۔ میرے پاس ہزار ساڑیاں سہی مگر شادی کے بعد تمہارے ہاتھ سے خریدی ہوئی ایک بھی تو نہیں۔ ہر عورت کی طرح میرا بھی دل چاہتا ہے کہ تم میرے لیے کوئی چیز خرید کر لاؤ اور میں چار ملنے والوں سے کہوں کہ یہ تم نے لا کر دی ہے۔ مگر وہ یہ سب کہہ نہ سکی اور چائے کی پیالی میں شکر گھولنے لگی۔ اس کے اندر کا سب کچھ اس کے ساتھ ہی گھل گیا۔

'میں نے سدھا کو کتنے دکھ دیے ہیں۔ بات بات پر طعنے، اف اس کے ساتھ میرا

رویّہ .... اس دن تو غصے میں فریج کی بوتل .... کتنا ڈھیر سارا خون نکلا تھا اس کے ماتھے سے۔ آج تو ایک بہت خوبصورت سی ساڑی لے ہی جاؤں گا۔ سدھا کے پاس جتنی ساڑیاں ہیں سب سے زیادہ قیمتی۔'

چار بجے وہ دفتر سے نکل کر ایک ساڑی کی دکان پر جا رکا۔ ہرے رنگ کی ساڑی پسند کی اور اسے لے کر تیز تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی جانب چلنے لگا۔ بس کا انتظار کرنے والوں کی لائن آج اسے بہت لمبی لگ رہی تھی۔ بس دیر تک نہیں آئی مگر ہر شخص مطمئن تھا، شاید کسی کو گھر جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ اکتاہٹ کے لہجے میں بڑبڑانے لگا۔

''بس والے بھی اپنی مرضی کے ہوتے ہیں کمبخت۔ وقت سے چلتے ہی نہیں۔''

لائن میں کھڑے لوگ اس کی بے چینی دیکھ کر مسکرا دیے۔ دور ایک بس نظر آئی۔ وہ بڑھ کر سب سے آگے پہنچ جانا چاہتا تھا کہ پیچھے سے آنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''تم ہری ساڑی میں بہت اچھی لگتی ہو ــــــ''

مڑ کر دیکھا۔ ہری ساڑی میں ملبوس ایک عورت اور غالباً اس کا شوہر، کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ہری ساڑی ــــ خوبصورت عورت ــــ اور اس کا شوہر ــــ جو ہری ساڑی میں ملبوس عورت کی تعریف کر رہا تھا ــــ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، دم گھٹنے لگا، جیسے دل کی دھڑکنیں تھک کر رک جانا چاہتی ہیں۔ اس کے پیر کپکپائے اور پھر اسے محسوس ہوا کہ پیر پتھر ہو گئے ہیں۔ اب اس کا پورا جسم پتھر ہو گیا تھا۔ دل و دماغ آخر پتھر کیوں نہیں ہو جاتے وہ اس حالت میں اکثر یہی سوچتا۔

''اچھا یہ بتاؤ سدھا، راکیش کو تمہاری کون سی چیز پسند تھی؟''

سدھا اس سوال سے پریشان ہو گئی تھی۔

''آپ راکیش کے بارے میں آخر کیوں پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں اسے بھولنا چاہتی ہوں۔''

'اچھا' ابھی اسے بھولی نہیں ہیں دیوی جی۔ آخر پہلا شوہر جو تھا ــــ'

کندھے اُچکائے اور ہنستے ہوئے بولا۔

''میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میرا اتنا بھی حق نہیں تو مت بتاؤ۔''

''نہیں بنجے ایسی بات نہیں ہے۔''

''پھر تم اس کے بارے میں کچھ بتانے سے کیوں کتراتی ہو؟''

سدھا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

'میں کہاں کتراتی ہوں۔ جب بھی کچھ بتاتی ہوں، تم ہی عجیب سے ہو جاتے ہو۔ اس دن اس کے قد کے بارے میں پوچھا' میں نے بتایا تو تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا، ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ توڑ ڈالا اور اپنا سارا ہاتھ زخمی کر لیا۔ مجھ سے بہانہ کر دیا کہ پیر سلپ ہو گیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر آن گرا۔''

''نہیں، یہ تمہارا وہم ہے سدھا.......... سچ مچ میرا پیر پھسل گیا تھا۔ اچھا بتاؤ نا، تمہاری کون سی چیز پسند تھی اسے؟''

بات کو ختم کرنے کے لیے سدھا نے اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد تو کچھ نہیں پوچھو گے؟''

''اچھا بابا.......... نہیں پوچھوں گا۔''

''راکیش اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھ پر ہری ساڑی بہت اچھی لگتی ہے۔''

کئی بسیں گزر گئیں مگر وہ خیالات میں گم ہری ساڑی کا پیکٹ ہاتھ میں لیے پتھر بنا کھڑا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ راکیش ایک خوبصورت اور بہت قیمتی ہری ساڑی لیے بس اسٹاپ پر کھڑا سوچ رہا ہے کہ سدھا اتنی قیمتی ساڑی دیکھ کر کتنا خوش ہوگی۔ ہری ساڑی بہت پسند کرتی ہے نا، کرے بھی کیوں نہ، مجھے بھی تو وہ ہری ساڑی میں بہت اچھی لگتی ہے۔ جب یہ ساڑی دیکھے گی تو ہولے سے اچھلتے ہوئے کہے گی۔ ''مائی گاڈ.......... اتنی اچھی...... ارے واہ کتنی قیمتی ہے.......... او مائی سوئیٹ راکیش...... پچ۔'' چما.......... نہیں دھماکا۔ بنجے کا دل اچھل کر رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا۔

'کیا سدھا میری ساڑی دیکھ کر بھی خوش ہوگی؟ اگر ہوگی بھی تو مجھ پر کیا احسان کرے گی، قیمتی چیز کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہی ہے۔ کیا وہ راکیش کی لائی ہوئی ساڑیاں دیکھ کر خوش نہیں ہوئی ہوگی؟ بلکہ اب اسے اتنی خوشی کہاں ہوگی، جتنی کہ پہلی بار راکیش کی ساڑی پا کر ہوئی ہوگی۔''

"راکیش............راکیش...........راکیش۔ وہ اب مر چکا ہے۔ مگر کہاں مرا ہے؟
ہاں وہ مر چکا ہے اور میں اپنے کندھوں پر اس کی ارتھی کا بوجھ بھی محسوس کر رہا ہوں۔"

اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور ماتھے پر کچھ نفرت، کچھ مایوسی، کچھ بے بسی اور کچھ رقابت کے جذبات سے پُرشکنیں اُبھر آئیں۔ دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا جیسے پسلیوں سے نکلنے کو بے تاب ہو۔ اس نے پیکٹ کو توڑ مروڑ کر سڑک کے کنارے والی جھاڑی میں پھینک دینا چاہا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور اس کے قدم خود بخود ساڑی کی دکان کی طرف لوٹ پڑے۔

آج پھر آدھی رات ہوگئی ہے۔ سنجے نہیں آیا ہے۔ سدھا ہے، خالی کمرہ ہے، کپکپاتی نظریں ہیں اور ہلتی ہوئی دیوار—— مگر آج سدھا خود کو ہلکا محسوس کر رہی ہے۔ اسے سنجے کا انتظار ہے بھی اور نہیں بھی۔ آج نہ سنجے پر غصہ آرہا ہے اور نہ اپنی قسمت پر رونا۔ صرف سنجے کا مسکراتا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔

"سدھا میری بات کا جواب دو...........کیا تمہیں منظور نہیں؟"

"مگر سنجے میرا اتیت............"

"پھر وہی اتیت کی بات—— مجھے تمہارے اتیت سے کیا لینا ہے۔ مجھے تو تم سے، ہاں صرف تم سے سروکار ہے۔"

دروازے پر دستک کے ساتھ ہی "دھڑاک" سے ماضی کا دروازہ خود بخود بند ہوگیا اور سدھا نے اٹھ کر وہ دروازہ کھول دیا جس پر سنجے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سدھا کو لگا کہ سنجے کے ہاتھ میں ایک پیکٹ ہے مگر لمحے بھر میں ہی اس کی نظریں اس سراب سے نکل آئیں اور اس نے دیکھا کہ سنجے کے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ نہ اس کا دل دُکھا، نہ دم گھٹا اور نہ ہی وہ سنجے سے لپٹ کر زاروقطار روئی۔ بس کچن میں جا کر کھانا گرم کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد تلے ہوئے آلو اور پھلکے میز پر لگا دیے۔

"مجھے معاف کر دو سدھا...........میں آج بھی ساڑی نہ لا سکا۔"

"میں نے آپ کے لیے آلو تلے ہیں...........کھائیے نا۔"

"سدھا تلے ہوئے آلو تو اسے بھی بہت پسند تھے۔"

"پھر وہی راکیش کی بات.......آپ نے تو کہا تھا اب اس کا ذکر نہیں ہوگا۔"

لیکن تم کیسے سمجھیں کہ میں راکیش کے بارے میں .... اس کا مطلب تمہارے ذہن پر راکیش اب بھی چھایا ہوا ہے''۔

''ہاں .... ہاں چھایا ہوا ہے میرے ذہن پر۔''

آج پہلی بار سدھا کا لہجہ تلخ تھا۔ وہ اٹھی اور بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ سنجے نے بھی کچھ نہ کھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

سدھا کی بانہیں بستر پر کچھ اس طرح پڑی تھیں کہ اسے محسوس ہوا، وہ آنکھوں سے نہیں، بانہوں سے اسے گھور رہی ہے۔ اس کی دونوں بانہیں پکڑ کر اٹھانا چاہا مگر دھم سے بیچ میں راکیش آن کودا اور سدھا کو بڑے پیار سے اٹھانے لگا۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی اٹھی اور راکیش سے لپٹ گئی۔

سنجے نے اپنے ذہن کو جھنجوڑا اور پھر ایک بار چاہا کہ سدھا کو اٹھا کر گلے لگا لے مگر اسے یاد آیا کہ ایک بار جب اس نے اپنا پسندیدہ ناول ''Love, My First Experience'' سدھا کو لا کر دیا تو اس نے یہ کہہ کر الگ رکھ دیا تھا کہ میرا پڑھا ہوا ہے اور بار بار کسی چیز کے دہرانے سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔

دیوار ہل رہی ہے .... بہت زور زور سے ہل رہی ہے .... اب تو کئی دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ یہ کیا؟ یہ تو پورا کمرہ ہل رہا ہے۔ دیوار اور زور سے ہلنے لگی اور پھر ایک دم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔ صبح ہوئی تو سدھا نے خود کو اس کمرے سے، اس گھر سے اور سنجے سے بہت دور پایا۔ اب وہ کتنے ہی سمندروں کی مسافت طے کر کے ویران صحراؤں میں آن پہنچی تھی۔

ناشتے کے بعد دونوں صوفے پر آن بیٹھے۔ سدھا کچھ کہنا چاہتی ہے، یہ سنجے کو بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو سنجے۔''

کوشش کے باوجود اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پائی اور انگلیوں سے اپنی آنکھوں کے کوروں کو خشک کرنے لگی۔ سنجے نے صوفے کی پشت پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ وہ آہستہ سے سدھا کے کندھے کو چھو بھی لے اور سدھا سمجھے کہ یہ سب کچھ انجانے میں ہوا ہے۔ سدھا نے کھسکتے ہوئے کہا۔

''میں جارہی ہوں سنجے .... ہمیشہ کے لیے۔
''مگر کہاں؟ ''
''کہیں بھی .... تمہاری زندگی سے، بہت دور۔''
''مجھے اکیلا چھوڑ کر ؟''

سنجے نے کچھ اس انداز سے اس کے دل کے نرم گوشوں کو ٹٹولا جیسے اسے امید ہو کہ سدھا جذباتی ہو کر کہہ اٹھے گی۔

''نہیں سنجے، میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ رہوں گی ——''

مگر سدھا نے ایسا کچھ نہیں کہا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہاں .... مگر تمہارے ہی بھلے کے لیے۔ میری وجہ سے بہت دکھ ہوتا ہے نا؟''
''سدھا یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔''
''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سنجے۔ مجھے وشواس ہو گیا ہے کہ تم میرے ساتھ کبھی سُکھی نہیں رہ پاؤ گے۔ دیکھو اپنا پورا خیال رکھنا۔ اور ہاں صبح پیچھے والی بُوا جی آئی تھیں، میں نے کہہ دیا ہے کل سے کھانا بنانے آجائیں۔ بجلی کا بل آگیا ہے، آپ کی دراز میں رکھ دیا ہے۔ وقت پر جمع کر دینا، کہیں کنکشن نہ کٹ جائے۔''

ایک لمحے کے لیے سدھار کی تو سنجے کو محسوس ہوا کہ بل جمع کرنے میں دیر ہو گئی ہے اور کنکشن کٹ چکا ہے۔ سدھا اپنے اندر کی تمام قوت کھو چکی تھی مگر کوئی طاقت تھی جو یہ سب کہنے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔

''دودھ والے کا دو مہینے کا حساب ہے۔ پیسے مانگ رہا تھا مگر میرے پاس کچھ کم تھے۔ تین چار دن میں دینے کو کہہ دیا ہے۔ دھوبی آیا تھا، کہہ رہا تھا، بارش کی وجہ سے کپڑے تیار نہیں ہو پائے ہیں۔ بدھ کو لے کر آئے گا۔ اس بار پندرہ کپڑے ہیں، گن لیجیے گا۔ اخبار والے سے کہہ دیا ہے، اب ''سریتا'' نہ لائے۔ اور ہاں آپ کی نیلی قمیص جو مجھ سے پریس کرنے میں جل گئی تھی، وہ کونے والے رفوگر کے یہاں ہے، کہہ رہا تھا، رفو شاید نہ ہو سکے۔''

اب سدھا کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ ان میں آنسوؤں کا ایک بھی قطرہ نہیں

تھا، شاید وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہی اس کے آنسو تھے۔ نجے نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیا اور انتظار کرنے لگا کہ شاید وہ اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ یا کچھ نہیں تو ہٹا ہی دے اور صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو جائے۔ مگر سدھا یوں بیٹھی رہی جیسے احساس ہی نہ ہوا ہو کہ اس کی گردن میں کسی کا ہاتھ بھی ہے۔ اس نے سدھا کو اپنی آغوش میں چھپا لینا چاہا مگر لگا کہ یہ سدھا نہیں ہراکیش کی چتا کی بجھی ہوئی ٹھنڈی راکھ ہے۔

ڈائنگ ٹیبل، گرین کرٹین اور......... پینٹنگ.........سدھا ہی تو خرید کر لائی تھی۔ اور وہ چھوٹی سی تین پہیوں کی سائیکل..........اس پر تو نجے خوب ہنسا تھا اور کہا تھا۔

"ابھی دو سال نہیں میڈم......"

سدھا کی کراہتی ہوئی نظریں کمرے میں بکھر گئیں۔ وہ اٹھی اور الماری سے اپنے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔ نجے اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ سدھا نے اپنے تمام کپڑے سوٹ کیس میں رکھ کر چابی کپکپاتے ہاتھوں سے نجے کو تھما دی اور خود نہانے کے لیے باتھ روم چلی گئی۔ نہانے کے بعد آج اس نے ہری ساڑی پہنی تھی ——

ہری ساڑی میں ملبوس سدھا پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ نجے بھی اسٹیشن آیا ہے۔

"سدھا جا رہی ہے.......... اکیلی.......... بالکل اکیلی۔ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر —— "

"نہیں نہیں، میں اسے روک لوں گا.......... نہیں جانے دوں گا.......... لیکن سدھا اکیلی کہاں ہے؟"

اسے محسوس ہوا کہ سدھا اکیلی نہیں، اس کے ساتھ "کوئی اور" بھی ہے۔

"سدھا کی چیخ.........؟ نہیں یہ تو انجن کی سیٹی ہے۔ گارڈ نے ہری ساڑی.........نہیں ہری جھنڈی دکھا دی ہے —— "

نجے نے سدھا کا ہاتھ پکڑ لیا اور جیب سے نکال کر کچھ تھماتے ہوئے بس اتنا کہا۔

"سدھا انکار مت کرنا —— "

کھڑکی میں بیٹھی سدھا کو اس نے غور سے دیکھا۔ وہاں سدھا نہیں تھی، صرف ہری ساڑی تھی جس کا پلو کھڑکی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ نجے نے اپنی جیب ٹٹولی۔ جیب میں وہ چیز

موجود تھی، جو اس نے سدھا کو دی تھی۔ سدھا نے کب لوٹا دی، اسے یاد نہیں۔ ٹرین چل دی —

وہ بھی ٹرین کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی ہے، اب وہ دوڑ رہا ہے۔ وہ بچے ہے .... نہیں وہ راکیش ہے۔ وہ دوڑ رہا ہے۔ وہ کہاں دوڑ رہا ہے؟ وہ تو وہیں کھڑا ہے۔ بالکل وہیں، اسی جگہ۔ اگر دوڑتا تو سدھا کے ساتھ ہوتا۔

ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دور جاتی ٹرین کی طرف دیکھا۔ سدھا کی ہری ساڑی کا پلو کھڑکی سے نکل کر ہوا میں لہرا رہا تھا۔

اب وہ پلیٹ فارم سے لوٹ پڑا ہے، ٹرین بہت دور جا چکی ہے، وہ گھر بھی واپس آ گیا ہے مگر ہری ساڑی کا پلو .... ہاں ہزاروں ہری ساڑیوں کے پلو اب بھی اسی طرح ہوا میں لہرا رہے ہیں۔

دس بیگھے کھیت

چھدّا چمار، جس نے اپنی زندگی کے تیس سال بے فکری سے گہری نیند سو کر گزار دیے تھے، آج رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ بار بار اٹھ کر اپنے شلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھتا اور جب ان روپیوں کو محفوظ پاتا جو ٹھاکر ویدرام سے بیل خریدنے کے لیے اُدھار لے کر آیا تھا تو سکون کی سانس لیتا اور پھر اپنے پھٹے ہوئے کھیس کو اوڑھ کر لیٹ جاتا۔ سردیوں کی رات تھی، کڑکڑاتا جاڑا اور پھٹا ہوا گاڑھے کا کھیس۔

آج اسے پہلی بار کھیس کے پھٹے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ وہی کھیس تھا جو کئی سال پہلے ٹھاکر ویدرام نے دیا تھا اور وہ اب تک اس کھیس کو کشمیری اون کے کمبل سے زیادہ گرم محسوس کرتا آیا تھا، مگر آج سردی پھٹے ہوئے کھیس سے گھُس گھُس کر اس کے جسم کو گلائے دے رہی تھی۔ وہ رات بھر اپنے سر کو گھٹنوں میں دبائے گٹھری بنا پڑا رہا۔ اس طرح لیٹنے سے اسے سردی بھی کم محسوس ہو رہی تھی اور اس کے شلوکے کی جیب بھی محفوظ ہو گئی تھی۔

چھدّا ایک محنتی مزدور تھا۔ گاؤں کے کسانوں کے ہاں مزدوری کرتا اور خوش رہتا۔ وہ کسی کا پابند نہیں تھا اور نہ ہی اس پر کسی ذمّہ داری کا بوجھ تھا۔ دراصل وہ پابند ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کسان کے یہاں جم کر ماہوار نوکری نہیں کر سکتا تھا اور پھر وہ ہل کا کام بھی نہیں سنبھال پاتا۔ اس نے تو زندگی بھر پھاوڑے اور کھرپی کا ہی کام کیا تھا۔

چھدّا چمار ٹھاکر ویدرام کا چہیتا مزدور تھا۔ آڑے ترچھے وقتوں میں ٹھاکر ویدرام ہی چھدّا چمار کے کام آتے۔ روپیہ پیسا، کپڑا لتّا، اناج گڑ، جس چیز کی بھی ضرورت پڑتی، ٹھاکر ویدرام اسے مزدوری کی پیشگی سمجھ کر دے دیتے اور اس کے بدلے میں ضرورت پڑنے پر کام کراتے رہتے۔ چھدّا کی صورت پر ٹھاکر جی کو دیکھتے ہی ایسی چمک آ جاتی جیسے ٹمٹماتا ہوا دیا تیل کی دھار کو دیکھتے ہی تیز لو کے ساتھ چمکنے لگتا ہے۔ وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد گاؤں بھر میں سانڈ کی طرح گھومتا پھرتا، ملہار گاتا اپنے ہم جولیوں میں جا بیٹھتا اور بڑے فخر سے کہتا۔

''اوپر پرماتما اور نیچے ٹھاکر جی۔ پھر وہ پھکر چوں کرے ——''

زمینداری ختم ہونے کے بعد چک بندی کا دور دورا شروع ہوا۔ گاؤں میں چک بندی دفتر کھولا گیا۔ نائب قانون گو اور لیکھ پال تو گاؤں میں ہی رہنے لگے۔ اے سی او صاحب بھی روزانہ دفتر پہنچ جاتے اور کبھی کبھی سی او صاحب بھی دورے پر آ جاتے۔ جن لوگوں کی زمینیں الگ الگ تھیں انہیں ایک ہی جگہ زمین دے کر چک بنا دیے گئے۔ چک بندی کے وقت چار فی صد زمین کٹوتی میں کاٹ کر چک بنائے گئے تھے۔ کٹوتی کی زمینوں کو سرکار نے بے زمین اچھوتوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ جب تک یہ زمین ہریجنوں اور جاٹووں میں تقسیم نہ ہو جائیں، گرام سماج کے سپرد کر دی گئی تھیں۔

ٹھاکر ویدرام کی زمین بھی الگ الگ کھیتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کچے دس بیگھے کا ایک کھیت، جو دوسرے کھیتوں سے خاصے فاصلے پر تھا، ان کی زمین کا سب سے اُپجاؤ کھیت تھا۔ جب یہ کھیت چک بندی کے دوران بچت میں نکل گیا تو ٹھاکر ویدرام کو بہت ملال ہوا۔ اس کھیت کو ٹھاکر بڑی محنت سے جوتتے، بوتے، پانی وقت پر دیتے اور کھاد .... کھاد تو اس کھیت میں آنکھ بند کر کے ڈالتے۔ کھیت سڑک کے کنارے تھا اس لیے اس میں جو بھی پیدا ہوتا اس کی خبر قرب و جوار کے تمام گاؤں والوں کو رہتی۔ جب کوئی راہ گیر گزرتا تو تھوڑی دیر کھیت کی

مینڈ پر بیٹھتا، اس کا جائزہ لیتا اور پھر یہ کہتا ہوا وہاں سے اٹھتا۔

''کھیت تو جے ہے۔ جا میں مالک کتنو کھاد ڈلوات ہے جو دھرتی سیاہ پڑی رہت ہے۔ گیہوں تو بارہ من بیگھا سے کم نہ ہوت ہوں گے۔''

یہ آخری فصل تھی۔ اس کے بعد کھیت پر ٹھاکر ویدرام کا قبضہ نہیں رہے گا۔ وہ کھیت کی مینڈ پر بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ گیہوں کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اس برس تو گیہوں کی بالیاں ٹھاکر ویدرام کو ہر سال سے زیادہ بڑی اور موٹی نظر آرہی تھیں۔ ٹھاکر ویدرام کی حسرت بھری نظریں کھیت میں لہلہاتے پودوں کے ساتھ ہچکولے کھانے لگیں۔ اس فصل کے بعد کھیت پر اپنا حق نہ رہنے کا خیال آتے ہی وہ ایک گہری سانس کے ساتھ چلم کے دھوئیں کو اندر لیتے اور پھر بری طرح کھانسنے لگتے۔ جس طرح پانی ڈوبتے ہوئے انسان کی روح نکل جانے کے بعد اس کی لاش کو اوپر پھینک دیتا ہے اسی طرح وہ تمام مناظر جو برسوں سے کھیت میں زندہ دبے ہوئے تھے، بے روح ہو کر اُبھر آئے۔ اب ٹھاکر ویدرام سر پر گلابی صافہ باندھے، ہاتھ میں لمبی اور مضبوط، سرسوں کا تیل پلائی ہوئی لاٹھی لیے کھیت کے بیچوں بیچ کھڑے بھولا سے کہہ رہے تھے۔

''جرا گہرا کونٹر مار، دیکھت نہ ہے کھیت کی گھاس تک نہ ٹوٹ رہی ہے، اوپر ہی اوپر جوتے جات ہے۔''

بھولا بے چارہ اس سے گہرا اور کیا جوتتا، بیلوں کی جان نکلی جارہی تھی اور پھر پورے گاؤں میں بھولا سے اچھا ہل واہا کوئی دوسرا تھا بھی نہیں۔ کھیت جُت جانے کے بعد سُہاگا چلا تو ٹھاکر ویدرام نے پٹڑے پر چار آدمیوں کو کھڑا کر دیا تاکہ ڈھیلے پھوٹ کر ریت بن جائیں۔ دسیوں بار کھیت کو جوتنے کے بعد کھاد سے پاٹ دیا گیا۔ دوسرے کسانوں نے جب اتنا کھاد پڑتے دیکھا تو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

''جتنی کھاد ٹھاکر جی دس بیگھے میں ڈلوات ہیں، اتنی تو ہماری پوری پچاس بیگھے میں نہ ڈلپاوت ہے۔ یا کھیت کو ٹھاکر جی دل کھول کے کموات ہیں اور اتنی لاگت لگات ہیں کہ گریب گربا اگر اتنی لاگت لگائے تو ایک بیگھا بھی نہ کر سکے۔''

کسی راہ گیر نے ٹھاکر ویدرام کو پالاگن کی تو سارے مناظر بکھر کر کھیت کی لہراتی فصل میں جذب ہو گئے اور انہوں نے گھوم کر اس آدمی کو دیکھا جو کہہ رہا تھا۔

"ٹھاکر جی گیہوں کی پھسل کے بعد یا میں کا بواؤ گے؟"

ٹھاکر ویدرام نے اسے جواب دیے بغیر چلم کا لمبا سا گھونٹ لیا اور کھانسنے لگے۔

ٹھاکر جی کو خاموش دیکھ کر راہ گیر جیسے خود سے ہی باتیں کرنے لگا۔

"ٹھاکر جی اپنی سگری دھرتی سے جادہ یا میں ہی لاگت لگات ہیں۔ یہ دھرتی بھی تو سونا اگلے ہے۔ گیہوں کے بعد یا میں دھان بڑے جور کے ہوں گے۔"

ٹھاکر ویدرام کی کھانسی جیسے اندر ہی رہ گئی اور وہ چلم کو کھیت کی مینڈ پر اُلٹ کر اس آدمی سے کچھ کہے بغیر وہاں سے چل دیے۔ مگر کچھ سوچ کر پلٹے اور پیر سے چلم کی آگ بجھانے لگے۔

گیہوں کی فصل کٹ جانے کے بعد اس کھیت پر ٹھاکر ویدرام کا دخل نہیں رہا اور وہ گرام سماج کے ماتحت بغیر جتائی بوائی کے کئی سالوں تک پڑا پڑا بنجر ہو گیا۔

آج اس دس بیگھے کھیت میں پرانے مکھیا اور موجودہ پردھان اپنے ساتھ گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھوں کو لیے کھڑے تھے۔ ان کے علاوہ پٹواری اور نائب قانون گو بھی وہاں موجود تھے۔ ٹھاکر ویدرام کو بھی بلا لیا گیا۔ پنچایت بیٹھی اور پنچوں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے نائب قانون گو سے کہا کہ اس کھیت کو چھدّا چمار کے نام لکھوا دیا جائے۔ اس کے پاس زمین بھی نہیں ہے اور آدمی بھی محنتی ہے۔ اس کھیت کو اچھی طرح جوت کما سکے گا۔ ٹھاکر ویدرام نے اس کی تائید کی۔ لہٰذا چھدّا چمار کو بلا کر لگان جمع کرنے کو کہا گیا تا کہ اندراج کے رجسٹر میں اس کا نام چڑھ سکے۔ چھدّا دوڑتا ہوا گھر پہنچا اور اپنی کُل پونجی اپنی پتنی کی ایک ہنسلی، جو چاندی کی تھی، لا کر پنچوں کے سامنے رکھ دی۔ پردھان نے اسے خرید لیا اور لگان کے روپے وصول کر کے اس کے نام کا اندراج کر لیا گیا۔

مندر کا گھنٹا بجا۔ چھدّا کی گھر والی نے اٹھ کر چکی پیسنا شروع کر دی۔ دوسرے گھروں سے بھی چکی چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد چڑیوں کا چہچہانا شروع ہو گیا۔ چھدّا، جو رات بھر پھٹے کھیس میں لپٹا اپنے شلوکے کی جیب کو پکڑے کروٹیں بدلتا رہا تھا، دھوتی، کرتا، شلوکا اور انگوچھا لے کر بمبے کی طرف نکل گیا اور پتیم پور کی پینٹھ سے بیل خریدنے کے لیے جانے کی تیاری میں کپڑوں کو بمبے کی پکی پلیا پر پیٹ پیٹ کر دھونے لگا۔ جلدی جلدی کپڑے بمبے کی پٹری پر سوکھنے کے لیے پھیلا دیے اور دوڑ کر اپنی گھر والی کے

پاس جا پہنچا۔

''دیکھ آج پینٹھ جانا ہے، ایک لتا میں چار روٹی اور ایک بڑی سی گُڑ کی ڈلی تیار رکھیو۔ میں ابھی حال اپنے کپڑا لے کر آوت ہوں۔''

چھدا کپڑے سوکھنے کے انتظار میں تھوڑی دیر بمبے پر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور پھر جب اس سے صبر نہ ہو سکا تو آدھے گیلے اور آدھے سوکھے کپڑے لے کر گھر کی طرف تیز تیز قدموں سے چل دیا۔ کپڑے پہنے، جوتیوں پر تیل چپڑا اور کپڑے میں بندھی روٹیاں لے کر پینٹھ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کوئی ایک کوس چلا ہوگا کہ ویدرام سے اُدھار لیے روپیوں کے گھر پر چھوٹ جانے کا خیال آ گیا اور سرپٹ بھاگتا ہوا گھر واپس آیا۔ روپیوں کو دھوتی کی گانٹھ میں مضبوطی سے باندھا، دھوتی میں لانگ لگائی اور تیز چلنے میں رکاوٹ ڈالنے کے ڈر سے جوتیوں کو ہاتھ میں لے لیا۔

چھدا کی بیوی نے شام کو جلدی ہی کھانا تیار کر لیا تھا۔ آج اس نے چھدا کے لیے مکا کی روٹی کا ملیدہ بھی بنایا تھا۔ جب سورج غروب ہونے تک چھدا نہیں آیا تو وہ پریشان ہونے لگی اور طرح طرح کے برے خیالات اس کے ذہن میں ابھرنے لگے۔ وہ رات میں گھر پہنچا تو محلے کے کچھ لوگ اس کی پتنی کو تسلی دے رہے تھے۔ چھدا کو دیکھتے ہی سب لوگوں نے اس پر سوالات کی بوچھار کر دی۔

''تم اتنی رات گئے تک کا کرت رہے؟''

''تیری سکل اتنی اتری بھئی چوں ہے؟''

''تم کھالی ہاتھ چوں آئے؟ تمرے بیل کہاں ہیں؟''

چھدا نے پورا قصہ سنایا اور سر پٹخ پٹخ کر کہنے لگا۔

''آج دلالوں کے چکر میں پھنس کر میری گانٹھ کٹ گئی بھیا .... ہائے میرے روپیا ....''

گیہوں کی بوائی کا وقت آ گیا تھا۔ دوسرے کھیتوں میں گیہوں بوئے جا چکے تھے۔ چھدا چمار کے کھیت میں تو ابھی ایک بار بھی ہل نہیں نکلا تھا۔ آخر کار وہ بھولا کے پاس گیا اور بولا۔

''بھیا بھولا .... ہم بڑے دکھی ہیں۔ ٹھاکر جی سے بیل کھریدنے کو روپے

اُدھار لیے اور جیب کٹوا کر، لوٹ کے ہم گھر کو آئے۔ اب کس منہ سے ان کے پاس روپے مانگن جائیں۔ تم ہی ہمری مدد کرو۔ بس ایک بار ہمرے کھیت میں ہل نکال دو۔ روپے پھسل پر لے لینا۔''

بھولا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھیا دس بیگھے کی جتائی، وہ بھی تم پھسل پر دو گے۔ اچھا تم ایسا کرو جب تمرے بیل آجائیں تو ہمرے کھیت میں ایک بار جتائی کر دیجیو۔ حساب برابر——''

چھدّا خوشی سے سر ہلانے لگا۔

''اچھا بھیا، ٹھیک ہت ہے——''

ایک جتائی تو بھولا نے کر دی مگر گیہوں بونے کے لیے تو دسیوں بار کھیت کو جوتنا پڑتا ہے اور پھر کھیت بھی ایسا جو کئی سال سے نہ جتا ہو اور پڑے پڑے بنجر ہو گیا ہو۔ چھدّا نے بھولا کی بہت خوشامد کی مگر اس کے پاس ایک تو اتنی فرصت نہیں تھی، دوسرے وہ بھی غریب آدمی تھا، اتنا کہاں تھا اس کے پاس کہ دوسرے کا کھیت بغیر پیسے کے ہی جوتتا رہے۔ کھیت میں دیسی کھاد ڈالنے کا تو چھدّا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا، ہاں انگریزی کھاد کا ایک کٹّا خریدنے کے لیے پردھان سے کچھ روپے ادھار لے آیا تھا۔ بیج بھی ایک پڑوسی سے بازار بھاؤ سے کچھ مہنگا ادھار لے لیا تھا۔ دس بیگھے کھیت میں کم سے کم تین کٹّے یوریا کھاد، دو کٹّے ڈی اے پی اور ایک کٹّا پوٹیشیم کھاد کا ہونا ضروری تھا مگر اس کے پاس تو صرف ایک ہی کٹّے کے پیسے تھے۔ وہ اپنی چلم لے کر کھیت کی مینڈ پر جا بیٹھا اور لمبے لمبے کش لگانے لگا۔

اب اس کی چلم کی آگ بجھ چکی تھی۔ اس نے جب چلم میں پھونک ماری تو راکھ اڑ کر اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

''یا سے تو پہلے ہی کھوس تھے چھدّا راجا۔ جمین دار بنو گے، دور کے ڈھول سہانے، جب پاس جاؤ تو پتا چلت ہے۔ کھیتی کرنا تو ٹھاکرن ہی کے کام ہیں۔ گریبوں کے بس کی تو وہی مجبوری ہے، گریب تو اسی میں کھوس رہت ہیں۔ اتنی لاگت کہاں دھری ہے ان کے پاس جو یا میں لگائیں۔ واہ رے پٹواری کھوب پھانسا ہمیں جمین داری کے کھواب دکھا کے——''

''کیا بات ہے چھدّا، کیسے اداس بیٹھے ہو؟''

پیچھے سے پٹواری نے آواز دی۔ چھدّا نے گھوم کر دیکھا، دل شاد پٹواری کھڑا مسکرا

رہا تھا۔ چھدّا کو اس کی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی تمام مصیبتیں اور دشواریاں پٹواری کو ایک ایک کر کے گنا دیں اور پھر پوچھا۔

''اب تم ہی بتاؤ میں کا کروں پٹواری ساب؟''

دل شاد پٹواری نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھ چھدّا، سرکار نے یہ زمینیں بھوم ہین اچھوتوں کو اس لیے دی ہیں کہ وہ بھی دوسرے کسانوں کی طرح زمین والے ہو جائیں اور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ ہمارے ملک کا اتیہاس بتاتا ہے کہ یہاں ہمیشہ سے اچھوتوں کو جانوروں سے بھی زیادہ بدتر اور پست سمجھا جاتا رہا ہے۔ گاندھی جی نے چھوا چھوت کو دور کرنے کا نعرہ بلند کیا تھا اور آج ہماری سرکار اچھوتوں کو زمین دے کر، انہیں خوش حال بنا کر، اس نعرے پر عمل کرنا چاہتی ہے۔ سرکار نے یہ بھی سوچا ہے کہ وہ اچھوت جو اب تک محنت مزدوری کی بنا پر ہی گزر بسر کرتے آئے تھے، ان کے پاس بیج اور دوسرے سامان کے لیے پیسا نہیں ہوگا۔ اس لیے سرکار نے قصبوں میں بینک بھی کھلوائے ہیں، جہاں سے بیل، بیج اور کھاد آسانی سے مل سکتا ہے۔ تم بھی پیتم پور جا کر بینک سے مدد لو اور فائدہ اٹھاؤ۔ اس طرح بیٹھے رہو گے تو کوئی کام نہیں بنے گا۔ آج تو چھٹی ہے، کل صبح جا کر بینک کے مینجر سے ملنا، وہ تمہیں سب طریقے بتا دیں گے۔''

دوسرے دن علی الصباح اٹھ کر پیتم پور کو روانہ ہوتے وقت اس نے سوچا تھا کہ اس دن تو وہ پیتم پور میں دلالوں کے چکر میں آ گیا تھا لیکن آج وہیں سے بیل، کھاد اور بیج لے کر لوٹے گا۔ پیتم پور پہنچ کر جب اس نے بینک کے دروازے پر تالا پڑا دیکھا تو بوکھلاہٹ میں ایک آدمی کو پکڑ کر پوچھنے لگا۔

''چوں بھیا، جے بنک چوں بند ہے؟''

اس آدمی نے اوپر سے نیچے تک اس کا جائزہ لیا اور اس کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔

''بینک دس بجے کھلتا ہے اور ابھی سات بجے ہیں۔ تم کہیں بیٹھ کر دس بجے تک آرام کر لو۔ کس گاؤں سے آئے ہو بھیا؟''

چھدّا چمار جیسے اپنے گاؤں کا نام ہی بھول گیا تھا۔ کبھی اس کے منہ سے ''بنک'' نکلتا، کبھی ''بیل'' اور وہ ہکلاتا ہی رہ گیا۔ سات بجے سے دس بجے تک کے تین گھنٹے اس کے

لیے تین جنم سے زیادہ طویل ہو گئے تھے اور وہ ان تین گھنٹوں میں جانے کتنی بار اپنی فصل بو اور کاٹ چکا تھا۔

دس بجے بینک کا دروازہ کھلا۔ چھدّا کی جان میں جان آئی اور وہ لپک کر مینجر صاحب کے پاس جا پہنچا۔

''منیجر ساب، ہمرے لیے ایک بیلن کی جوڑی، چار کٹا کھاد اور گیہوں کا بیج ترنت دے دو۔''

مینجر صاحب اس کا منہ تکنے لگے اور پھر بولے۔

''دیکھو پہلے تم یہ بتاؤ کہ کس گاؤں کے رہنے والے ہو؟''

چھدّا نے اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے تنک دوری پر ایک گاؤں ہے ٹونٹرا کھیرا۔ وہیں کے ہم نواسی ہیں۔''

مینجر نے اسے سمجھایا۔

''یہ فارم لو، اس پر اپنا اور اپنے پِتا کا نام لکھو اور یہ بھی لکھو کہ تمہارے پاس کتنی زمین ہے۔ اس کے بعد اس پر گاؤں کے دو ذمہ دار آدمیوں کی گواہی دلواؤ۔ یہ لے جاؤ، کل یہ کام کرا کے لے آنا۔''

چھدّا نے فارم کو ہاتھ میں پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''تو منیجر ساب، کل سامان مل سکت ہے؟''

مینجر صاحب نے کہا۔

''نہیں بھئی............ پہلے تو کل تم اس فارم کو ہمارے پاس جمع کر دینا۔ ہم ایک ہفتے کے اندر اندر گواہوں کی تصدیق کر لیں گے۔ اس کے بعد اپنی زمین کا کچہری جا کر خسرہ اور کھتونی نکلوا لانا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے دونوں گواہوں کی زمینوں کے بھی انتخاب نکلواتے لانا۔ اس میں تمہارے کچھ روپے خرچ ہوں گے۔ یہ لا کر ہمارے پاس جمع کر دینا۔ پھر دیر پور بلاک سے ایک سلپ لے آنا۔ اس میں یہ لکھا ہوگا کہ ان کے اوپر بلاک کا کوئی قرضہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کوآپریٹو بینک سے بھی کلیرینس لیتے آنا۔''

چھدّا چمار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ مینجر صاحب کی شکل گھورے جا رہا تھا۔

مینجر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''پھر ہم ان کو ہیڈ آفس بھیج کر دس پندرہ دن میں لون منظور کروالیں گے۔ اس کے بعد تم جس دکان سے سامان خریدنا چاہو اس کا بل لاکر ہمیں دے دینا۔ ہم اس دکان دار کے نام چیک کاٹ دیں گے۔ تمہیں سامان مل جائے گا۔''

چھدا منیجر کی شکل تکتا ہی رہ گیا اور یہاں سے بھی مایوس ہو کر وہ نہ جانے کس کس طرح اپنے گاؤں پہنچا۔ دوسرے کھیتوں میں گیہوں کی فصل ایک ایک بالشت کی ہو چکی تھی اور چھدا چمار کا کھیت ابھی یوں ہی پڑا تھا۔ کئی بار بھولا کے گھر کے چکر لگائے، اس کی خوشامد کی، ہاتھ پیر جوڑے تب جا کر وہ بوائی کے لیے تیار ہوا، اور گیہوں بغیر کھاد کے ہی بو دیے گئے۔ روپے جو پردھان سے کھاد کے لیے اُدھار لیے تھے وہ بھی اتنے دنوں میں کھا پی کر برابر کر دیے۔ اب گھر میں فاقے ہونے لگے تھے۔ نرائی ڈسائی کے لیے پیسے تو تھے نہیں جو مزدوروں سے کراتا۔ لہٰذا وہ اور اس کی گھر والی کھیت میں کھر پی لیے دن دن بھر بیٹھے رہتے۔ اسے کھیت سے اتنی فرصت ہی نہیں مل پاتی جو کسی دوسرے کے یہاں جا کر مزدوری کرتا۔ گھر والی پڑوس سے ادھار لیتے لیتے تنگ آ چکی تھی۔ کبھی ایک دو دن کو فرصت ملتی تو چھدا کسی کی مزدوری پر نکل جاتا مگر کھیت میں نرائی ڈسائی، رہٹ سے پانی لگانا، جانوروں سے فصل بچانا، یہ سب بھی تو اسے ہی کرنا تھا۔

فصل تیار ہو گئی۔ کٹنے کا وقت آ گیا۔ دونوں میاں بیوی فصل کاٹنے میں جٹ گئے۔ چھدا چمار کے کان ہر راہ گیر کے منہ سے یہ سنتے سنتے پک گئے۔

''یہ وہی کھیت ہے جا میں بارہ من بیگھا کے گیہوں کٹت رہے۔ اب تو بیس سیر بیگھا کے بھی ہے جائیں تو بڑی بات ہے۔ یا کھیت کی تمام گام میں چرچا تھی، یاسے اچھا پورے بار میں کوئی اور کھیت نہ ہت ہو۔ جانے کون کے ہاتھوں یہ کھیت لگ گیو کہ ستیاناس ہے گیو کھیت کو ـــــ''

جب بھی وہ یہ سنتا تو اسے لگتا کہ لوگ کہہ رہے ہیں۔

''یہ وہی چھدا چمار ہے جو کبھی سانڈ کی طرح ادھر اُدھر گاؤں بھر میں گاتا پھرتا تھا اور آج اپنے قرض داروں سے منہ چھپائے چوروں کی طرح چھپتا پھرتا ہے۔''

فصل کاٹ کر کھیت کے کونے پر ڈھیر لگا دیا گیا۔ اسے کھوندنے کے لیے بیلوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا پھر ایک بار بھولا کی مدد لینا پڑی اور آٹھ دن میں گیہوں الگ اور بھوسا

الگ ہو گیا۔ گیہوں تولے گئے تو وہی پانچ من، یعنی بیس سیر بیگھا کی پیداوار۔ جتنی لاگت آئی تھی، اس سے بھی کم۔

چھدّا وہیں گیہوں کے ڈھیر کے سامنے اپنا ماتھا پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نظر اٹھا کر سڑک کی طرف دیکھا تو اسے ٹھاکر ویدرام کی گیہوں سے لدی گاڑی جاتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے گردن جھکا لی اور سوچنے لگا۔

''اتنے روپے ٹھاکر جی کے، بھولا کے پیسے، پردھان کی رقم، اور............ اور......''

ٹھاکر ویدرام کی گاڑی جب اس کے برابر سے گزری تو اس نے دیکھا کہ گاڑی بری طرح لدی ہوئی ہے اور بوجھ سے دونوں بیلوں کی گردنیں جھکی جا رہی ہیں۔ وہ دیر تک بیلوں کی جھکی ہوئی گردنوں کو دیکھتا رہا۔

○○○

ژِمبان

ژمبان نے نظریں اُٹھا کر کلب کے بڑے ہال کی چھت کی جانب دیکھا اور وہ بہت دیر تک فانوس کو گھورتا رہا۔ فانوس میں تیز روشنی والے بے شمار بلب جگمگا رہے تھے۔ لیکن اس کی آنکھیں روشنی کی عادی ہو چکی تھیں اور وہ بلب ٹمٹماتے دیوں کی شکل اختیار کرنے لگے تھے۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ دُھواں لالٹین کی چمنی کو سیاہ کر چکا ہے اور اب گھونگھٹ کاڑھے پرانی حویلی میں نواڑ کی مسہری پر سہمی سمٹی بیٹھی دُلہن کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا، ہاں اس کے ماتھے پر سجے جھومر کے نگ کسی تیز روشنیوں والے فانوس کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ وہ بہت دیر تک کلب کی چھت میں لٹکے فانوس کو گھورتا رہا اور پھر اس نے نظریں جھکا کر سامنے بیٹھی اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اب تک کئی پیگ چڑھا چکی تھی ـــــ ژمبان کی سانسیں رُک گئیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ آنکھوں کے حلقوں کے نیچے باریک سی دو نسیں اُبھر آئیں اور تھرکنے لگیں، بالکل اسی طرح جیسے پیگ چڑھانے کے بعد ہلکی سی جھرجھری سے سامنے بیٹھی لڑکی کے ننگے شانے تھرکنے لگتے تھے۔

لڑکی نے مسکرا کر جام اس کی طرف بھی بڑھایا۔ اس نے اپنی بائیں پنڈلی کی ایک رگ میں پھڑ پھڑاہٹ محسوس کی، پنڈلی میں نرم نرم گدگداہٹ سے اس کے منہ کے لعاب کی روانی بڑھی اور اس کے ہونٹ نم ہوگئے۔ جب اس نے ایلین کے ہاتھ سے جام لیا تو انجانے میں ہی ایلین کی گرم انگلیاں ژمبان کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ محسوس ہوا کہ انگلیوں کے راستے جسم کی رگوں میں شراب دوڑ گئی ہے اور پھر وہ سرخ شراب اس کے رخساروں پر آ کر جم گئی۔ سامنے دیکھا سرخ گھونگھٹ کے سائے میں اس کی بیوی کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ایلین شراب کا گلاس خالی کر چکی تھی اور اب ژمبان کے چہرے کی نسیں کچھ زیادہ ہی اُبھر آئی تھیں۔ ہونٹوں میں لرزش ہوئی۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بڑی بے نیازی سے ایلین بولی۔

''مسٹر ژمبان آپ اس کلب میں کب سے آتے ہیں؟''

''چند مہینوں سے.......... ریگولر نہیں.......... کبھی کبھی.......... مگر آپ کو میرا نام؟''

''آپ اس سے پہلے..........'' ایلین کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ ژمبان بول پڑا۔

''میں دراصل یہاں سے کچھ دُور اپنے فارم ہاؤس پر رہتا تھا۔ اب نوکری ملنے کے بعد شہر میں ہی..........''

''تعجب ہے!!'' ایلین نے ژمبان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جی!'' ژمبان چونکا اور جب اس کا ذہن ایک خاص نقطے سے ہٹا تو چہرے کی نسیں بھی ڈھیلی پڑنے لگیں، وہ دھیرے دھیرے مٹنے ہی والی تھیں کہ ایلین بول پڑی۔

''تعجب ہے تعارف اِتنے دِنوں.......... میرا مطلب ہے اتنی راتوں کے بعد ہوا۔''

''راتوں کے بعد..........؟'' ژمبان نے سوچا۔ ''ہاں اتنی راتوں کے بعد۔''

ایلین نے اپنا تعارف کب کرا دیا تھا یہ اُسے احساس ہی نہیں ہوا۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ ایلین کی طرف بڑھا دیا اور گہری سانس لی، پھر چھوڑی اور اس کے بعد سانس جیسے تھم گئی۔ سانس خود بخود تھم گئی تھی یا وہ سانسیں لے کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، پتا نہیں مگر اب ژمبان نے چہرے پر پہلے سے زیادہ تناؤ محسوس کیا اور پھر جانے کس طرح یہ تناؤ آڑھی ترچھی لکیروں کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اب اس کا چہرہ کافی بھیانک ہوگیا تھا اور کان کی دونوں لویں سرخ ہوگئی تھیں۔ لڑکی اٹھی، ننگے شانے پر پرس لٹکا کر کندھا اس طرح اُچکایا کہ سینے کا ابھار کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوگیا اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے کلب کے پورٹکو کی طرف

چل دی، جہاں اس کا ڈرائیور اسٹیرنگ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

آج ژمبان اپنے ہی دفتر میں اجنبیوں کی طرح بیٹھا دروازے کو تکے جا رہا ہے۔ جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔ دفتر کی نیم تاریک فضا اور یہ اجنبیت .... بیٹھے بیٹھے غنودگی کا احساس .... سامنے میز پر رکھا پیگ .... ننگے شانوں والی گوری چٹی گداز اور بھرپور عورت .... اندھیرا .... فانوس کی تیز روشنی اور لالٹین کی چمنی پر جمی سیاہی .... سُرخ جوڑا پہنے دُلہن اور اندھیرے میں ڈوبتی اس نازنین کی سیاہ موٹر گاڑی، گویا اندھیرے میں موٹر گاڑی نہیں اس کی اپنی نبض ڈوب گئی ہو۔

کلب کی وہ رات اور دفتر کی یہ دوپہر۔

"ہر چیز میں ربط قائم کرنے کی کوشش فضول ہے ژمبان۔"

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے دفتر کے قیمتی صوفے پر ایلن کو بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ حیران اس لیے نہیں کہ وہ یہاں موجود تھی، بلکہ اس لیے کہ گداز بانہوں اور ننگے شانوں والی شراب کے پیگ چڑھاتی مِس ایلن آج مجسم پاکیزگی کی دیوی نظر آ رہی تھی۔ لباس اس سلیقے سے زیب تن تھا جیسے اس کے مقدس جسم کو سجدہ کر رہا ہو۔ اس کو دیکھتے ہی ژمبان نے پلکیں جھپکا کر خیر مقدم کیا۔ ایلن کے باریک گلابی ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ اس کے چہرے سے نور کی شعاعیں اس طرح پھوٹ رہی تھیں کہ ژمبان کی پیشانی سجدے میں جھکنے کے لیے تڑپ اُٹھی۔ اب ژمبان کی آنکھوں میں متانت، چہرے پر سنجیدگی، ہونٹوں پر شائستہ مسکراہٹ اور پیشانی پر اعتماد کے نقوش اُبھر آئے تھے۔ اُس نے پلکیں جھپکیں اور پھر دیکھا کہ ایلن کے سُرخ ہونٹوں پر کپکپاہٹ رقص کر رہی ہے۔ باریک ہونٹ موٹے ہوتے جا رہے ہیں جیسے اُن میں رس بھرتا جا رہا ہو۔ اس کا مقدس اور پاکیزہ لباس کافور کی طرح بدن سے غائب ہوتا جا رہا ہے اور پھر کشمش ریشم جیسی گداز بانہیں اور تھرکتے ننگے شانے۔

ژمبان اور کلب کی وہ رات ——— ژمبان کی سانسیں رُک گئیں اور ہونٹ نم ہو گئے۔ اس کے ہونٹوں سے شائستہ مسکراہٹ اور پیشانی سے اعتماد کے نقوش اس طرح غائب ہونے لگے جیسے ایلن کا پاکیزہ اور مقدس لباس اُس کے بدن سے غائب ہوا تھا۔ چہرے کا تناؤ بھی بڑھنے لگا۔ اس نے تھوک نگلا تو اس کی گردن پر اُبھرا کوا پہلے اوپر اور پھر نیچے اس طرح گیا اور آیا جیسے اوپر جانے اور نیچے آنے کی کشمکش میں پھڑپھڑا کر رہ گیا ہو۔

''تعجب ہے تعارف اتنے دنوں .... میرا مطلب ہے اتنی راتوں کے بعد ہوا۔''

''راتوں کے بعد ....؟'' ژمبان سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا سکریٹری ایک شخص کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی ژمبان کو اپنی پتلون کی خالی جیب کے نیچے ران کی کھال میں گدگدی کا احساس ہوا اور آنے والے شخص کی پیشانی بہت چمکدار محسوس ہوئی، گویا پیشانی نہیں، کلب میں لٹکا فانوس ہو۔ آنے والا شخص کُرسی پر بیٹھتے ہوئے اس انداز سے مسکرایا کہ ژمبان کی پتلون کی جیب بھاری ہونے لگی اور وہ بار بار تھوک نگلنے لگا، لیکن اس کی گردن کے کوّے نے یا تو چلنا بند کر دیا تھا یا پھر اچانک گردن پر اتنی چربی چھا گئی تھی کہ اب اس کا نظر آنا ممکن نہیں تھا۔

جب ژمبان نے گردن جھکائے نظریں اُٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا تو ژمبان کی آنکھوں پر چشمہ نہیں تھا، لیکن محسوس یوں ہو رہا تھا جیسے اس کی گول گول آنکھیں عینک کے موٹے اور دھندلے شیشوں سے باہر جھانک رہی ہوں۔ سُود وصُول کرتے کسی گھاگ منیم کی مانند ——— تھوڑی کے نیچے کا گوشت اتنا زیادہ لٹک گیا تھا کہ اب وہ چہرے سے نہایت غبی شخص محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کا منہ خالی تھا لیکن جب وہ سامنے بیٹھے شخص سے بات کرتا تو لگتا کہ پان کے کئی بیڑے اس کے منہ میں ہیں اور بس تھوڑی ہی دیر میں سامنے والے کا چہرہ گاڑھی اور غلیظ پیک سے رنگ جائے گا۔ بات کرتے کرتے پتا نہیں کیسے اس کا نچلا ہونٹ ٹیڑھا ہونے لگا اور دائیں طرف کچھ زیادہ ہی کِھسک آیا۔ صاف شفاف قمیص کا ''وائٹ کالر'' جو فیشن کے عین مطابق تھا اب کسی معمولی دفتر کے بابو کے کالر کی طرح گندا اور بدہیئت نظر آنے لگا تھا۔

وہ شخص ژمبان کی طرف جُھکا تو ژمبان کی ناک کے نتھنے پھول گئے۔ دونوں باچھوں میں تھوک کے جھاگ جمع ہونے لگے کہ سامنے والا شخص زیرِ لب مسکرایا اور جتنی رقم سوچ کر آیا تھا اُس سے بہت کم اس کے ہاتھوں میں تھمائی۔ ایک ضروری کاغذ پر دستخط لیے اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ژمبان اُسے روکنا چاہتا تھا، کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس شخص نے ایک ہاتھ سے کرسی کھسکائی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اور پھر چپراسی نے خبر دی کہ چیف نے اُسے بلایا ہے۔ وہ چیف کے کمرے میں گیا اور جب کافی دیر بعد واپس آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اسے دیکھ کر ایلن زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

وہ کھسیا گیا۔

''ایلن ہنستے ہوئے بولی۔ ''ژمبان تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟''

''جی!''

وہ ہنسی سے بے قابو ہو رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

اس کی ہنسی اور تیز ہوگئی۔

''یہ تمہارا فارم ہاؤس نہیں میٹروپالیٹن شہر ہے۔ یہاں دل کے تار چہرے تک نہیں آتے۔''

اور پھر اس نے دیکھا کہ ایلن کا چہرہ بہت بھولا بھالا اور کم سن ہوتا جا رہا ہے۔ اُسے لگا کہ وہ ایلن نہیں اسکی ننھی سی بچی ہے۔ بچی کے چہرے پر معصوم فرمائشیں رقص کر رہی ہیں۔ اسے اپنی بچی کے لیے فراک خریدنی ہے۔ دکاندار اُس کے چہرے کو گھورتا ہے اور پتا نہیں کیوں ایک معمولی فراک کی بھی اتنی قیمت بتاتا ہے کہ اس کے پاؤں کانپنے لگتے ہیں اور وہ خالی ہاتھ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے بیڈروم میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی ننھی سی بچی قہقہہ مار کر ہنس پڑتی ہے۔ ہنستے ہنستے ایلن کا چہرہ سُرخ ہوگیا ہے۔ بیوی کے سُرخ جوڑے کا رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ اور ماتھے کا جھومر فرش پر گر کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔

ایلن ہنس رہی تھی۔

اُسے لگا کہ وہ شخص سامنے کھڑا قہقہے لگا رہا ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھ پر تھوک کر چلا گیا تھا اور وہ اس ہاتھ کو اپنی پتلون کی خالی جیب سے پونچھ کر مطمئن ہوگیا تھا۔

ایلن کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔

وہ تیزی سے باہر نکلتا ہے۔

دفتر کے باہر سڑکیں، بسیں، عمارتیں گویا پورا شہر ہنس رہا ہے، قہقہے لگا رہا ہے۔ ژمبان چہرہ چھپائے تیزی سے گزر جانا چاہتا ہے مگر قہقہے...... مذاق اڑاتے قہقہے ہر موڑ پر راستہ روک لیتے ہیں۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا ہے اور ہانپتے ہانپتے اپنے بیڈروم میں رکھی آرام کرسی پر اوندھے مُنہ جا گرتا ہے۔

جب اس کی سانسیں تھمنے لگیں تو اس نے منہ اُٹھا کر سامنے رکھے آئینے کی طرف دیکھا اور ڈر گیا۔ اُسے آئینے میں فارم ہاؤس کے اونچے اونچے درخت نظر آئے جو کارخانے کی چمنیوں

کی طرح دھواں اُگل رہے تھے اور اس کا فارم ہاؤس جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کیے اس کی بچی بے خبر سو رہی تھی۔ بچی کی ماں کو سوئے کئی برس گزر گئے ہیں۔ جب وہ مری تھی تو ژمبان کے چہرے پر پہلی بار ایک نس اُبھری تھی۔ آج وہ اپنے چہرے پر اُبھری بے شمار نسوں میں اُسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک اس کے سینے میں ٹیس کے ساتھ درد کی ایک لہر اُٹھی اور چہرے سے کئی نسیں غائب ہو گئیں۔

آنتوں میں مروڑ، سینے میں اینٹھن اور دماغ میں جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ وہ شدید درد سے کراہنے لگا، جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں، رگوں میں خون جم گیا اور اس کے نتھنے پھول گئے۔

اُس نے سانس روک کر جسم کی پوری قوت کو سمیٹا اور بہت دیر تک سانس روکے رہا۔ چیخنا چاہا مگر گلے سے آواز نہیں نکلی۔

گردن کی تمام نسیں تن گئیں، چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ پھر اُسے لگا کہ چہرے کی تمام نسیں پھٹ گئی ہیں اور ان سے بہت سالا وا نکل کر ناک، کان، حلق اور آنکھوں کے ذریعے جسم میں داخل ہو رہا ہے۔ آرام کرسی سے گردن ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ پتا نہیں کس وقت نیند آ گئی اور پھر صبح ہوئی تو اس نے آئینے میں دیکھا کہ چہرے کے تمام نقش مٹ چکے ہیں۔

اُس کے چہرے کے تمام نقش مٹ چکے تھے اور چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن جسم کے اندر درد کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ اٹھا، دروازہ کھول کر باہر نکلا تو دیکھا کہ ایلن سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اندر سے ٹوٹے اور باہر سے مسکراتے انسان کی مانند وہ بھی مسکرا دیا۔ ہاں ایک میٹروپولیٹن شہر کے باشندے کی مانند وہ بھی مسکرا دیا۔ اب ٹھیک ہے...... ایلن نے کہا۔

"ہاں مگر..................." اور ژمبان سوچنے لگا۔

وہ کیا سوچ رہا تھا............؟

چہرہ دیکھ کر اب یہ بتانا بہت مشکل تھا۔

○○○

دوسرا حادثہ

شہر کے باہر چنگی والے پیٹرول پمپ کے قریب دیا لو جاٹ ایک پنجابی ڈھابے میں کچھ ڈرائیور دوستوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ڈھابے کے مالک سردار جی کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ رام داس جو ڈرائیوروں میں نیتا جی کے نام سے مشہور تھے، اپنے نیتائی انداز میں بول اٹھے۔

''سردار جی کچھ جوڑی ہوئی روکٹڑ ڈھابے میں بھی لگا دو۔ یہ دو پلو چھپر کسی کمر جھکی بڑھیا کی طرح منہ پھاڑے کھڑا ہے۔''

سردار جی مسکرادیے اور کرچھے سے بھٹی کی بھوبل باہر کھینچنے لگے۔ بھوبل میں کچھ دم توڑتے انگارے، جو پوری طرح راکھ بننے سے رہ گئے تھے، اپنے اوپر راکھ کی بھوری پرت اس طرح چڑھائے ہوئے تھے جیسے بوڑھے وجود کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ دیا لو جاٹ نے ڈھابے میں کام کرنے والے چھوکرے کو پکارا۔

''اوئے لونڈے، لا ایک چمچ چینی اور ڈال، اور دیکھ ایک چائے منگلوا کو دے آ۔ ٹرک دھو رہا ہوگا۔''

اسے شہر آئے پانچ سال گزر گئے تھے مگر تھا اب بھی وہی دیہاتی جاٹ۔ ڈرائیوری کے دھندے نے زیادہ پتی کی چائے پینا تو سکھا دیا، مگر چینی اب بھی ساڑھے تین چمچے ہی ڈالتا تھا۔ مزاج میں دیہاتی اکھڑ پن، بدھی ایسی موٹی کہ ہر کسی سے بگاڑ کھاتا، اور دیالو بھی ایسا کہ اگر کسی پہ دَیا آجائے تو اپنا سب کچھ نچھاور کر دے۔ شاید اسی لیے لوگوں نے دیا پرشاد کے بجائے اس کا نام دیالو جاٹ رکھ دیا تھا۔

چھوکرا گلاس میں ایک چمچہ چینی ڈال کر گھولنے لگا کہ باہر ایک بوڑھی عورت کی چیخ کے ساتھ ہی ''پکڑو۔ پکڑو۔ بھاگ گیا۔ نمبر دیکھ لو۔ کالی کار ہے، کالی'' کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس کے ساتھی دوڑ کر باہر پہنچ گئے، مگر وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا۔

''دیالو جاٹ تو یہاں بیٹھا ہے، باہر ایک بڑھیا کی کار سے ٹکر ہوگئی۔''

اس نے بے پروائی سے چائے کا گھونٹ لیا۔

''جانے دو...... اندھی دھندی بڑھیوں کو کس نے کہا ہے کہ سڑک پر چلیں۔''

اتنے میں ڈھابے کا چھوکرا اس کے پاس آیا۔

''دیالو کاکا، ڈکریا کی سب انتڑیاں باہر آ گئیں۔ بے چاری مر گئی۔''

اس نے چائے کا گلاس تپائی پر رکھا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا سڑک پر پڑی بوڑھی عورت کی لاش کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ عورت بہت بوڑھی تھی۔ پیٹ کے اوپر سے پہیا اتر گیا تھا۔ جھک کر غور سے دیکھا۔

''اب کیا دھرا ہے اس میں۔ موت آنی تھی سو آ گئی۔ کوئی ڈرائیور نے جان کے تھوڑی مارا ہوگا۔ تم سب کھڑے کیا کر رہے ہو۔ سپاہی کو بلاؤ اور لاش کو چیر گھر بھیج دو۔ سویرے سویرے ڈکریا نے سگٹ شگون بگاڑ دیا۔''

منگلوا نے پیچھے سے آ کر کہا۔

''دیالو کاکا، ڈھلائی ہوگئی۔''

''ہاں ہاں اتنی جلدی کاہے کی ہے، چائے تو پی لوں۔''

یہ کہتا ہوا اندر آیا اور تپائی سے گلاس اٹھا کر بچی ہوئی چائے پینے لگا۔ چائے ٹھنڈی

ہو چکی تھی مگر گھونٹ بڑی مشکل سے حلق کے نیچے اتر رہے تھے۔

"یہ بڑھیا تو کچھ کچھ اماں کی شکل ہے——"

اس نے باہر جھانک کر دیکھا، بھیڑ چھٹتی جا رہی تھی۔

"اس بے چاری کا تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔ کریا کرم کون کرے گا۔ کوئی تو ہوگا—— بیٹا، نہیں تو بیٹی۔ دُکھیاری بہت بوڑھی تھی۔ ناتی پوتے بھی ہوں گے۔ اماں بھی اب بہت بوڑھی ہوگئی ہے۔ پنساریوں کی مرچیں کوٹتے کوٹتے دکھائی بھی کم دینے لگا ہے۔ بابا تو مجھے اماں کے پیٹ میں ہی چھوڑ کر مر گئے تھے۔ اماں نے کھیتوں میں نلائیاں کیں۔ بوہروں کے چوکا باسن کیے۔ ایکھ کے ٹھونٹھ اکھاڑ اکھاڑ کر ایندھن اکٹھا کیا۔ گھر گھر چکیاں پیس کر دو چٹکی آٹا لائی۔ کھیتوں میں بچے کھچے آلو بینے۔ تب جا کے مجھے پالا پوسا، پاٹھ شالا بھیجا، پھر میرا بیاہ رچایا اور پوری گرہستی لے کر یہاں شہر میں آن بسی۔ مجھے لالا رگھو ویر کے ٹرک پر کلینر کی جگہ مل گئی۔ کئی سال تک ٹرک کے پہیے اتارے اور چڑھائے۔ بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر ٹرک دھویا اور پھر بھگوان کی دیا سے چلانا بھی سیکھ لیا، لائسنس بھی بن گیا اور ڈرائیوری بھی مل گئی۔ اب تو اماں بہت سکھی ہے۔ اپنی بہو کو کتنا پیار کرے ہے اور پوتے کو تو ہر سمے کلیجے سے چپکائے رہ وے ہے۔ چلتے سمے کتنے پیار سے بولی تھی: ارے دیالو، آج تو تیرا ٹھیلا متھرا جائے گا۔ میں نے کٹوردان میں پراٹھے اور اچار کی پھانک رکھ دی ہے۔ دیکھ، سمے سے کھالیو اور کشن بھگوان سے پرارتھنا کریو کہ مجھے چلتے ہاتھ پاؤں اٹھالیں۔ میرا کریا کرم اچھے ڈھنگ سے کریو۔ کہے دیتی ہوں۔ میں نے اماں کے پوپلے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اری اماں تو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ ابھی تو بھلے دن آئے ہیں۔

پھر اماں نے کٹوردان دیتے ہوئے کہا تھا۔ لا تیرے پاس کچھ پیسے ہوں تو دیتا جا۔ تیرا ابا لک دو دن سے جاڑے بُکھار میں پڑا ہے۔

سڑک پار والے ڈاگڈر بابو سے دوا لاؤں گی۔ تجھے تو پھکر ہے نہ ——"

سردار جی نے گلاس دھو کر پانی پھینکا تو بھٹی کے باہر پڑے ادھ بجھے کوئلے بے جان سی آواز کے ساتھ بجھ کر رہ گئے۔

"اماں.........اماں——"

اسے لگا کہ اس کے اندر سے کسی نے پکارا ہے۔ وہ اٹھا اور جیسے ہی بوڑھے چھپر سے

باہر نکلا، سر بلی سے ٹکرایا اور چھپر کا گلا سڑا پھوس، جو بالکل سیاہ ہو چکا تھا، اس کے کندھوں پر آن گرا۔ کپکپاتی نظروں سے اوپر کی جانب دیکھا۔ جگہ جگہ سوراخوں میں سے صبح کی زرد دھوپ جھانک رہی تھی۔ وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

بوڑھی عورت کی لاش اب تک باہر پڑی تھی۔ اب وہاں صرف چار چھ آدمی کھڑے رہ گئے تھے۔ اس نے بڑھیا کو چھو کر دیکھا۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کسی نے کار کا نمبر بھی لکھا، یا سب الوؤں کی طرح دیکھتے رہے۔ یہاں آرے لونڈے، کار کا رنگ کیسا تھا؟''

لڑکا سہم کر بولا۔ ''کالا.......... بالکل کالا.......... دیالو کا کا۔''

''حرام جادے کار والے مجھت ہیں، ان ہی کا راج ہے۔ جسے چاہا کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل دیا اور نکل گئے۔ اگر کار روک لیتا تو کون موت آجاتی، اسپتال لے جاتا تو بڑھیا بچ جاتی۔ نہیں تو کچھ روپے ہی تو دینے پڑتے، بچاری کا کریا کرم ہو جاتا۔ اب جلے گی بھی تو چندے کی لکڑیوں سے ——''

اس نے اپنے ٹرک کی طرف دیکھا۔ اس کے اوپر سورج کا گولا ایک بڑے سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ اسے لگا کہ گولے میں سے آگ کی لپٹیں نکل کر اس کے بدن میں اترتی جا رہی ہیں۔ وہ بھاگتا ہوا ٹرک کے پاس پہنچا تو اس کا کلینر منگلو بھی دوڑ کر وہاں پہنچ گیا۔ دیالو جاٹ نے اسے دھکا دے کر کھڑکی بند کر لی۔

''پرے ہٹ، پہلے حرام جادے کار والے کی منڈی توڑوں گا پھر چلوں گا متھرا۔ تو یہیں ٹھہر ——''

ٹرک تیزی سے واپس شہر کی طرف موڑا اور پوری رفتار سے سڑک پر دوڑانے لگا۔ دور تک کار نظر نہ آئی تو رفتار اور تیز کر دی۔

''شاید ریل کا پھاٹک بند ہو ——'' اس نے سوچا۔

سڑک صاف تھی مگر اسے جگہ جگہ بھیڑ نظر آتی، بوڑھی عورت کی لاش کو گھیرے ایک بھیڑ۔ اس نے آنکھوں کے کوروں کو صاف کیا اور دور تک نظر دوڑائی۔ پھاٹک بند تھا اور ایک کالے رنگ کی کار بھی کھڑی تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت کی ساتھ ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ گاڑی کی

رفتار کچھ دھیمی ہوگئی۔ اس نے مضبوط ہاتھوں سے اسٹیرنگ کو کس کے دبا لیا جیسے کار والے کی گردن دبا رہا ہو۔

"ابھی سالے کی منڈی پکڑ کر دو لاتیں جماؤں گا۔ گاڑی میں ڈال کر بڑھیا کی لاش کے پاس لے جاؤں گا۔ لوگ جتیائی کریں گے، ہڈی پسلی ایک کر دیں گے، پولیس مارے گی سو الگ۔ امیرجادہ کہیں کا۔"

مگر اس نے دیکھا کہ پھاٹک کھلا اور کار زن سے نکل گئی۔

"دھت تیرے کی۔"

اس نے مسمسا کر ریس اور بڑھا دی، اب ٹرک فل اسپیڈ سے سڑک پر دوڑ رہا تھا۔

گاڑی شہر میں داخل ہو چکی تھی مگر اس کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پانچ منٹ میں کار سے آگے نکل کر اسے روک لے گا۔ نظریں کار پر جمی ہوئی تھیں، اچانک ایک کتا ٹرک کے سامنے آ گیا۔ اس سے پہلے بھی کئی کتے اس کے ٹرک کے نیچے کچل کر مر چکے تھے۔ مگر آج پہلی بار اسے کتے کے جاندار ہونے کا احساس ہوا اور سٹپٹا کر اسٹیرنگ گھما دیا۔ گاڑی سڑک کے نیچے اتر گئی۔ کتا تو بچ گیا مگر گاڑی کو کچے پر لیتے وقت ایک بجھی بجھی چیخ اس کے کانوں میں رینگ گئی۔ پوری طاقت سے بریک لگا دیے۔ کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ ایک بوڑھی عورت پچھلے پہیے کے نیچے آ گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ابھی سانس باقی ہے اور وہ گردن ہلا ہلا کر کراہ رہی ہے۔ سر پر کافی چوٹ آئی تھی اور خون بہہ کر سڑک پر پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دوا کی شیشی تھی جو اس نے اب بھی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ اس نے پہچانا، یہ اس کی ماں تھی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ "اماں۔" چیخنا چاہا مگر اس کا گلا رندھ گیا۔ اب وہ نہ تو کچھ کہہ پا رہا تھا اور نہ ہی اسے کچھ دکھائی دے رہا تھا' نہ سنائی' بس بار بار ایک فقرہ کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہا تھا۔

"میرا کریا کرم اچھے ڈھنگ سے کریو، کہے دیتی ہوں ——"

اس نے گاڑی سے اترنے کے لیے پیر لٹکایا ہی تھا کہ کچھ آوازیں سنائی دیں۔

"مارو، ارے پکڑو، کہیں بھاگ نہ جائے، زندہ مت جانے دینا، اندھے ہو کے چلاتے ہیں۔"

پیر خود بخود وہیں کا وہیں رک گیا۔

"ہے بھگوان ——"

ان آوازوں کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور آواز سرسرائی۔
"کشن بھگوان سے پرارتھنا کریو کہ مجھے چلتے ہاتھ پاؤں اٹھالیں۔"
اس نے باہر جھانکا، لوگ اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ جلدی سے پیر اندر کیا اور کھڑکی بند کرلی۔ سورج کی کرنیں آگے شیشے کے پاس رکھے پیتل کے کٹوردان پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھیں جیسے کٹوردان کے وجود سے خون کے دھارے پھوٹ رہے ہوں۔
"میں نے کٹوردان میں پراٹھے اور اچار کی پھانک رکھ دی ہے، دیکھ سمے سے کھالیو۔۔۔"
دل میں آیا کہ کھڑکی سے کود کر اماں کے چرنوں میں اپنا سر رکھ دے۔
"اماں ...... ابھی تو بھلے دن آئے ہیں۔۔۔"
کھڑکی کھولی، مگر دیکھا کہ بھیڑ بالکل قریب آ چکی ہے اور لوگوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے، لوہے کی چھڑیں اور حلوائیوں کے کرچھے ہیں۔ چاہا کہ انہیں بتادے کہ یہ اس کی ماں ہے، مگر سنے گا کون؟ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، بدن ٹھنڈا پڑ گیا، آواز آئی۔ "کھینچ لو نیچے۔"
وہ تھرتھرا گیا پھر جسم کی پوری قوت کو سمیٹا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی سڑک پر چلنے لگی۔
"تیرا بالک دو دن سے جاڑے بخار میں پڑا ہے۔ سڑک پار والے ڈاگڈر بابو سے دوا لاؤں گی۔"

گاڑی ایک رفتار سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔۔۔
"اماں نے دوائی کی بوتل کتنی کس کے......"
گاڑی کی رفتار دھیمی کی، کھڑکی سے منہ نکال کر پیچھے پلٹ کر دیکھا، کچھ نظر نہ آیا، بس ایک لاش تھی جو سڑک پر پڑی تھی، اس کی اپنی لاش۔ وہ مر چکا تھا۔
آنکھیں بند کیں، پھر کھولیں تو دیکھا کہ اس کی لاش سڑک پر دوڑ رہی ہے۔ غور کیا، ایک کھلی جیپ تھی جو ٹرک کے پیچھے تیزی سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ جیپ میں کھڑے کچھ لوگ "پکڑو۔ پکڑو" کی آوازیں لگا رہے تھے۔ سر اندر کیا تو اوپر لگے آئینے پر نظر پڑی۔ وہ چونک گیا۔ یہ وہ نہیں تھا کوئی اور تھا جو اس کی جگہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اب وہ گاڑی روک کر نیچے کود جانا چاہتا تھا۔۔۔

اس نے گاڑی روکنے کے لیے ایکسیلریٹر سے پاؤں ہٹانے کی کوشش کی لیکن ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتا ہی گیا اور اس کی گاڑی بہت تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

○○○

برف اور پانی

''تمہارے چہرے کے آگے تو اس پہاڑی پر جمی برف بھی میلی معلوم ہوتی ہے۔''

سیما، جس کی شرٹ کا پچھلا دامن بازوؤں کو ہوا میں بار بار لہرانے کے سبب جینس سے نکل کر جیکٹ کے باہر آ گیا تھا اور جس کی بے باک ادائیں جسم کو ہر لمحے تھرکتے رہنے کا عادی بنا چکی تھیں، آج جاوید کی بات سن کر کچھ اس طرح شرما گئی تھی جیسے چوٹی پر جمی برف کی اوپری تہہ سورج کی پہلی کرن کو دیکھتے ہی پانی پانی ہو جاتی ہے۔

جاوید نے چنچل اور شوخ سیما کے دونوں بازو پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور تعجب یہ ہے کہ وہ بیٹھ بھی گئی۔ پھر اس نے سردی سے کپکپاتے ہاتھوں کو بغلوں میں چھپا لیا۔ آج سردی بہت تھی اور اس روز گرمی ....!

☆

''گرمی بہت ہے سیما۔ آؤ تھوڑی دیر اس مولسری کے نیچے بیٹھ لیں''

''کیوں؟ مجھے لائبریری جانا ہے، اس کے بعد فلاسفی کا پیریڈ ہے۔ تمہیں بیٹھنا ہے تو بیٹھو۔ سنیتا، مریم، عقیل اور رینکی کی طرح۔ بس بیٹھے رہو، جو ہونا ہے اپنے آپ ہو جائے گا، زمانے کا دستور ہے، وہ کیا ہے کہ...........''

''ارے بھئی تم سے تو پوچھنا غضب ہو گیا۔ اب جاؤ گی بھی یا..................''

''یا کیا..........؟ اوں..........یا کیا..........؟''

اور وہ بیٹھ گئی۔ پھر سنیتا بھی آ گئی۔ مریم، عقیل اور رینکی بھی۔

''لیجیے آ گئی آپ کی منڈلی..........کیجیے باتیں..........''

''یار سیما' تم پھر الجھ رہی ہو بے چارے جاوید سے۔''

''بے چارہ جاوید ——''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

''ہاں تو بے چارے جاوید صاحب آپ نے جیوتے ڈیئن کا انگریزی ناول Snow on the Hill پڑھا ہے؟''

اس سے پہلے کہ جاوید کچھ بولے' سیما خود ہی بول پڑی۔

'' تم نے کہاں پڑھا ہوگا۔ اس میں جو صاحب ہیرو کے نام پر مرکزی کردار نباہ رہے ہیں، وہ بالکل تمہاری طرح ہیں۔ آؤ بیٹھو..........بیٹھے رہو، بولو مت..........بور..........نہایت بور——''

''سیما میں نے وہ ناول پڑھا ہے۔ اس کے مرکزی کردار میں اور مجھ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ بے سمتی کا مسافر ہے، جب کہ میں اپنے ٹریڈیشن اور ویلیوز کا پابند۔''

''ٹریڈیشن اور ویلیوز..........''

سیما کے قہقہے کی گونج نے فضا کو دیر تک بوجھل بنائے رکھا۔

''کبھی اندھیری رات میں سورج کی روشنی سے آنکھیں چندھیائی ہیں آپ کی؟ بے چارے جاوید صاحب..........''

''میں نے سورج کو آنکھوں میں قید کر لیا ہے سیما — ''

جاوید کی نظریں سیما کے تمتماتے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اور جناب رات کی سیاہی سے محروم ہو گئے ہیں۔''

سیما نے زلفیں جھٹکیں تو آدھے سے زیادہ چہرہ سیاہ اور گھنیری زلفوں میں چھپ گیا۔

''لیکن..........''

''لیکن کیا؟''

اور جب بات طول پکڑنے لگی تو ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔ بس جاوید بہت دیر تک اس ناول کے مختلف پہلوؤں پر سیما سے بحث کرتا رہا، جب کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیوے ڈیئن نام کا نہ کوئی رائٹر ہے اور نہ ہی Snow on the Hill نام کا کوئی ناول۔

☆

لیکن آج اسے یقین ہو گیا ہے کہ جیوے ڈیئن نام کا رائٹر بھی ہے اور......اور Snow on the Hill نام کا ناول بھی۔ اور یہ یقین اسے اس وقت ہوا تھا جب سیما شرما کر برف کی طرح پگھل گئی تھی۔

برف پگھلی، پانی کے جھرنے گرے جیسے شہنائیاں بج رہی ہوں۔ برف پھر جمی، اس بار برف کا رنگ زرد تھا، ابٹن کے رنگ کی طرح۔ اور اس کے بعد برف پانی بن کر جاوید اور سیما کے دنوں، مہینوں اور برسوں کو نم کرتی رہی۔ آخر کار دونوں نے مل کر پہاڑی راستے کے ایک بڑے پتھر کو ڈھکیل ہی دیا۔ پتھروں کی رگڑ سے جو آواز ہوئی تو جاوید چیخ پڑا۔

☆

''کیا ہوا سیما؟''

''کچھ نہیں۔ شاید کچن میں بلی نے سارا دودھ گرا دیا۔ ابھی دیکھتی ہوں۔''

ایسے موقعوں پر وہ جھنجھلا جایا کرتا تھا مگر آج خاموش رہا۔

''ستیاناس ہو اس کالی بلی کا۔ آج تو..........''

وہ بڑبڑا رہی تھی اور جاوید مسکرا رہا تھا۔

''چلو سیما' آج پہاڑی کی اس چوٹی پر چلتے ہیں جہاں تم پہلی بار شرمائی تھیں اور چوٹی پر جمی برف خود بخود پگھلنے لگی تھی ——''

''اور دودھ؟''

☆

دودھ جیسے پوری پہاڑی پر جم گیا ہو، برف کچھ اس طرح جمی تھی۔ برف جمی تھی، نرم نرم پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی، جو برسوں سے ساتھ رہ رہے تھے ایک دوسرے کی طرف بہت دیر تک اس طرح دیکھتے رہے جیسے دو اجنبی ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

جاوید اجنبیت اور آشنائی کے احساس سے اس وقت واقف ہوا تھا جب اسی پہاڑی سے لوٹ کر وہ فیکلٹی لان میں سیما کے ساتھ کھڑا مولسری کے پیڑ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا.........

'کتنا اجنبی تھا کل تک یہ مولسری کا پیڑ، جب کہ ہم اکثر یہیں بیٹھا کرتے تھے۔ مگر آج پہاڑی سے لوٹنے کے بعد یہ کتنا آشنا ہو گیا ہے۔ اب یہاں سے آتے جاتے محسوس ہوتا ہے کہ اس درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی سیما کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ کس کا؟ پتا نہیں ....کہ اچانک اس کے پاس کوئی آبیٹھتا ہے۔ کوئی بھی ....بس میرے دل میں سارنگی کی دل سوز آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ سیما میرے پاس کھڑی ہے تو پھر پیڑ کے نیچے کون بیٹھا ہے؟ اور وہ جو اس کے پہلو میں ہے؟؟؟ نہیں.........

اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش میں سر اتنی زور سے ہلا کہ سیما پوچھ بیٹھی۔

''کیا ہوا جاوید؟''

''کچھ نہیں۔ بس ذرا سی محبت اور ذرا سی نفرت کا معاملہ تھا۔ تم کیا سمجھوگی۔''

''دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔''

اس نے بال جھٹکے اور آگے بڑھ گئی۔ جاوید کی نظریں سیما کے ٹھمکتے قدموں کے پیچھے دبے پاؤں چلتی رہیں۔ سیما نے اپنا پلوور اتار کر کمر سے باندھ لیا۔ بس جاوید کا دل دھڑکا تو دھڑکتا ہی چلا گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے سیما کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر راستے میں ینکی نہ مل جاتی تو آج قیامت ہی آجاتی۔

''جاوید دیوانوں کی طرح کہاں جا رہے ہو؟''

''ایں.........!'' وہ چونکا۔ ''لائبریری۔''

''ارے وہاں مت جاؤ۔ وہاں وہ جھکّی لڑکی گئی ہے ابھی۔''

☆

'اب میں اسے کیا بتاتا' ہاں میں ہاں بھی نہ ملا سکا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ یوں تو ینکی بھی بلا کی خوبصورت تھی، مگر سیما تو جیسے وہم اور یقین کی سرحد تھی، جو ہوتی تو ہے مگر محسوس نہیں ہوتی۔'

''کیا سوچ رہے ہو جاوید؟''

پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خوبصورت لمحہ بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

''اُف۔''

اس نے مڑ کر دیکھا پہاڑ کی چوٹی پر برف جمی ہوئی تھی اور اس کی بیوی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''جاوید شام ہو چکی ہے، گھر............''

''اُف سیما' تم آخر چاہتی کیا ہو؟ میں اپنے کھوئے ہوئے لمحوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور تم............''

سیما کو لگا کہ اس کا وجود کافور ہوتا جا رہا ہے۔

''کیا تم بھول گئی ہو کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں............''

''مجھے تو ایک ایک پل یاد ہے مگر میں سمجھی تھی کہ شاید تم سب کچھ بھول چکے ہو۔''

اس نے جیسے سیما کی بات سنی ہی نہیں اور دور ایک پتھر پر جا بیٹھا، اکیلا اور خاموش۔

☆

رات نے خاموشی کا دامن پھیلا دیا تھا۔ یونیورسٹی کے اسٹاف کوارٹروں کی کھڑکیوں میں روشنی چھپی بیٹھی تھی۔ سیما نے ہولے سے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ جاوید لان میں کودا اور دبے پاؤں کھڑکی کے نیچے آ کھڑا ہوا۔

''جاوید ہم روز کلاس میں ملتے ہیں پھر............''

اس نے سیما کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''جس میں ایڈوینچر نہ ہو وہ ملنا بھی کوئی ملنا ہوا۔''

''اُف۔'' اور سیما نے کھڑکی بند کر لی۔

جاوید نے کھڑکی پر یوں ہاتھ رکھا جیسے سیما کے دل کی دھڑکنیں گن رہا ہو۔

"کیا ہے ؟"

"جا رہا ہوں۔"

وہ مڑا.......... اور اس نے دیکھا کہ سیما پہاڑی کے ایک پتھر پر گردن جھکائے تھکی ہاری سی بیٹھی ہے۔ بال اس کے چہرے کو ڈھکے ہوئے ہیں۔ جتنا چہرہ نظر آرہا ہے وہ جھلسا ہوا سا ہے۔ پھر اسے لگا کہ خوبصورت ینکی اس کے پاس کھڑی قہقہے لگا رہی ہے۔ ینکی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔

☆

"جاوید اس سرپھری لڑکی میں آخر ایسی کیا بات ہے جو تم.........."

سوال پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا تھا۔

ینکی تم نے بلبل کو گاتے سنا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ گانے سے لمحے بھر پہلے اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔"

ینکی خاموش رہی۔

"بس اسی کیفیت کا نام ہے سیما۔"

اور ینکی نے جھنجھلا کر بال جھٹکے تو اس کا چہرہ گھنیری زلفوں کے گھونگھٹ میں چھپ گیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ زلفوں میں چھپا چہرہ ینکی کا ہے یا سیما کا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆

"اب آنکھیں کھولو۔"

کالج کے لان میں سیما دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اس کی طرف جھکی کھڑی تھی۔

"سیما کیا ہے بھئی..........؟"

"ہے کیا.......... کچھ بھی نہیں.......... تمہیں جی بھر کے دیکھنے کو دل چاہا' اس لیے آنکھیں بند کروا لیں۔"

''بس تمہاری یہی ادائیں تو ہفتوں کی نیند اڑا دیتی ہیں۔''

''تمہاری ہفتوں کی نیند تو عقیل نے اڑائی تھی۔ وہ ایک روز میرے ساتھ سوئمنگ پول کیا چلا گیا کہ قیامت آ گئی۔''

''سیما، تمہیں تو عقیل کے ذکر کا ایک بہانہ چاہیے۔''

''بہانے کی کیا ضرورت ہے وہ میرا دوست ہے۔ اس سے کبھی بھی مل سکتی ہوں میں۔''

''مل سکتی ہوں کیا مطلب؟ ملتی ہی ہو۔''

''دیکھو تم خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہو۔''

پھر جاوید نے سیما سے جو کہا وہ سن کر سکتے میں آ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی، پھر جاوید کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ نہ پشیمانی نہ غصہ نہ ناراضگی۔ نہ جاوید سے قطع تعلق کیا اور نہ ہی کوئی تعلق رکھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب وہ بالکل خاموش رہنے لگی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ کالج کا آخری سال تھا۔ امتحان ہو چکے تھے۔ فیئر ویل پارٹی ہو رہی تھی۔ جاوید سیما کے قریب آ کر اس طرح بیٹھا کہ اس کی کہنی سیما کے پیٹ سے جا لگی۔

'وہ بھڑک جائے گی اور بات کرنے کا بہانہ مل جائے گا'

اس نے سوچا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

''ہیلو ——''

''ہیلو ——'' اور بات ختم۔

فنکشن کے بعد وہاں سیما اور عقیل رہ گئے تھے۔ جاوید اندھیرے میں کھڑا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ ان دونوں نے اسے دیکھ لیا ہے۔

'یہ جانتے ہوئے کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں اگر سیما، عقیل سے قربت کا اظہار کرتی ہے تو اس کا مطلب وہ مجھ سے قربت کا اظہار کر رہی ہے۔ مجھے جلا کر ——'

اور ایسا ہی ہوا۔ سیما نے ہاتھ عقیل کے کندھے پر رکھا اور کنکھیوں سے دیکھا دور کھڑے جاوید کی طرف۔ دیکھا کچھ اس انداز سے تھا کہ جاوید کو محسوس ہوا جیسے ہاتھ عقیل کے نہیں اس کے اپنے کندھے پر رکھا گیا ہو۔ بس پھر کیا تھا جاوید کی ٹھنڈی سانسوں میں حرارت دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد عقیل نے اپنی راہ لی اور سیما اسٹاف کوارٹر والی سڑک پر مڑ گئی تو جاوید نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

''جی کہیے —— ''

سیما کے سرد رویے نے جاوید کے پورے جسم میں شعلے بھر دیے۔ وہ مسمسا کر رہ گیا۔ سڑک پر نظر دوڑائی، وہاں کوئی پتھر نہ تھا، سر پھوڑے بھی تو کس سے؟ اس کا جی چاہا کہ سیما کا سینہ چیر کر پتھر نکالے اور اپنے سر پر دے مارے۔

''سیما آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''اوں —— '' سیما نے بے نیازی سے پوچھا۔

''اف سیما —— ''

اب وہ پاگلوں کی طرح کچکچا کر ہوا میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔

دو چار ہاتھ سیما کے گال پر بھی پڑ گئے اور اس کی کلائی سے چوڑیاں ٹوٹ کر سڑک پر بکھر گئیں۔ وہ جھکا، اندھیرے میں ٹٹول کر چوڑیوں کے ٹکڑے سمیٹے، جیب سے کاغذ نکالا اور بڑے اطمینان سے چوڑیوں کے ٹکڑوں کو کاغذ کی پڑیا میں باندھ کر جیب میں رکھ لیا۔ سیما کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آج سیما بھاری پتھر پر خاموش اور اداس بیٹھی تھی اور ینکی قہقہے لگا رہی تھی، کھلکھلا کر ہنس رہی تھی، چہرہ پھول کی مانند کھلا ہوا تھا۔ جاوید آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ ینکی کے تھرکتے شانے اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ بڑھتا گیا اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے ینکی کے شانوں کو پکڑا۔ اداس بیٹھی سیما کے شانے جاوید کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ چونک پڑا۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ ہٹائے اور دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ خوبصورت ینکی برہنہ حالت میں مکھ پر کیس ڈالے سیما کے قدموں میں پڑی ہے۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے بڑھنا چاہتا ہے مگر اسے اپنے دونوں بازو بھاری ہوتے محسوس ہوئے۔

''ینکی —— '' اس نے چیخنا چاہا مگر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''سیما —— ''

''میں یہاں ہوں جاوید —— ''

سیما نے گھبرا کر کہا اور اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ میں یہاں سیما کی یاد میں کچھ پل بتانے آیا ہوں۔''

''جاوید تمہیں جس کی تلاش ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔''

''نہیں۔ مجھے سیما کی تلاش ہے، تمہاری نہیں۔''

''جاوید، میں وہی ہوں، تمہاری سیما۔''

''وہ تو تمہارے قدموں میں برہنہ.........''

''جاوید تم سے کہیں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔''

''کیسی غلطی؟''

''مجھ تک پہنچنے کا راستہ غلط چنا ہے تم نے۔ تم شاید کسی اور کے بدن میں تلاش کر رہے ہو مجھے۔۔۔''

اب سیما، جاوید کے اتنا قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی جیسے اس میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہو۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جو مجھ سے کھو گیا ہے، اسے پا کر ہی رہوں گا۔''

سیما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

''شام ہو چکی ہے، گھر.........''

''سیما۔''

ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں جاوید نے اتنی طاقت سے دھکا دیا کہ سیما کا سر ایک بڑے پتھر سے جا ٹکرایا اور اس کے ہاتھ کی چوڑیاں ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر پتھریلی زمین پر بکھر گئیں۔

سامنے چشمے کا نرم پانی سخت اور نکیلے پتھروں پر دھیمی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے چشمے کی طرف بڑھا اور جوتے اتار کر ٹخنوں ٹخنوں پانی میں اتر آیا۔ اب اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ برف کے ریزے آسمان سے گر کر اس کے سر پر جمنے لگے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ قدموں میں پانی بہہ رہا تھا، سر پر برف جم چکی تھی، لیکن پورا بدن جل رہا تھا۔

اوپر برفیلے پہاڑ۔۔۔ نیچے سمندر کی لہریں ۔۔۔ اور بیچ میں تپتے ریگستان۔۔۔
پہاڑوں سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں اور سمندر کا پانی لال ہو گیا۔

وہ پورا کا پورا جل رہا تھا اور اس کی روح سیما، اب ینکی کی لاش میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ اسے اپنے بہت قریب سے سیما کی آواز سنائی دی۔

"آنکھیں کھولو جاوید کہ آنکھیں بند کر لینا بزدلی ہے۔ حقیقت وہ نہیں جو آنکھیں بند کر کے نظر آتی ہے۔ حقیقت وہی ہے جو تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ باہر کچھ نہیں بدلا ہے، تمہارے اندر بدلا ہے۔ مجھے محسوس کرو اور آنکھیں کھولو۔"

"مگر ینکی ...."

سیما قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"اچھا یہ بتاؤ، ینکی تمہیں پھر کبھی ملی؟"

"نہیں۔"

"ملتی کیسے، وہ تھی ہی نہیں۔"

جاوید کے سر پر برف پوری طرح جم چکی ہے، قدموں میں پانی بہہ رہا ہے مگر اس کا پورا بدن جل رہا ہے۔ اسے سیما کے قدموں کی چاپ دھیمی ہوتی سنائی دی۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ سامنے ایک پگڈنڈی انجانی سمت کو جا رہی تھی، اس پر سیما کہیں دکھائی نہ دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا کہ پتھر پر خون کا ایک دھبا ہے اور چوڑی کے ٹکڑے زمین پر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ بڑھ کر ان چوڑی کے ٹکڑوں کو اٹھا لینا چاہتا تھا، مگر ایک انجانی طاقت اس کے قدم باندھے ہوئے تھی۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ جیب سے پرس نکال کر کانپتے ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا کہ ایک بوسیدہ کاغذ کی پڑیا ملی تو اس کے جسم کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں اور سانسوں میں سکون کی سنسناتی لہریں دوڑ گئیں جیسے اس کی یادداشت واپس آ گئی ہو۔ پڑیا کو جلدی سے کھول کر دیکھا۔ چوڑی کے ٹکڑے آپس میں سہمے سمٹے پڑے تھے۔ بڑی نرمی سے ان کو چھوا اور پھر چوڑی کے ان ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

پھر اس کے بعد جو دیکھا تو سامنے پتھر پر بکھرے چوڑی کے ٹکڑے غائب تھے۔

شام ہو چکی تھی اور سیما دور اس راستے پر جا رہی تھی جو ان کے اپنے گھر کی طرف جاتا ہے۔

○○○

چھلاوا اور وہ

''رات' اندھیری رات .... راتوں کا کیا ہے، وہ تو اندھیری ہوا ہی کرتی ہیں۔ میں اندھیری راتوں سے نہیں ڈرتا۔ میرا واسطہ تو اندھیری راتوں سے ہی پڑتا ہے۔''

وہ آدھی رات کو گاؤں سے باہر نٹنی کی قبر کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا۔ کالے بادل آسمان کو تاروں سمیت نگل چکے تھے اور اب زمین پر اتر کر اسے بھی نگلنا چاہتے تھے کہ وہ چیخ پڑا۔

''میں، میں نہیں ڈرتا، کسی سے نہیں ڈرتا، کالے بادلوں سے بھی نہیں —''

اور وہ ڈر گیا، جب اس نے لمبا چوڑا کالا آدمی برگد کے پیڑ سے اترتے دیکھا۔

''تو کون ہے؟'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔

وہ شخص جو اسے کالا نظر آ رہا تھا، اس کے سامنے کھڑا نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟''

''میں انسان ہوں۔''

تم انسان ہو؟" کالا آدمی مسکرایا۔
مگر تو کون ہے؟"
"تم انسان ہوتے تو مجھے ضرور پہچان لیتے، کم سے کم میری سفیدی دیکھ کر۔"
بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے کالے آدمی کی مسکراہٹ کو قہقہے میں تبدیل کر دیا تھا۔
"مگر تو تو کالا ہے؟"
اب کالے آدمی نے لرزا دینے والا قہقہہ بلند کیا۔
"میں کالا ہوں، یا تمہاری بینائی؟"
"ٹھیک ہے، مگر تو یہاں کیوں آیا ہے؟ میں تجھ سے نہیں ڈروں گا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"
لیکن خوف اس کے اندر کانپ رہا تھا۔ کالے آدمی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"نہیں ڈرتے، تو پھر مجھے اپنے اندر سما جانے دو۔"
وہ بے خیالی میں کالے آدمی کو گلے لگانے کے لیے بانہیں پھیلانے ہی والا تھا کہ خیال آیا: جب کلو چاچا لال گڑھی سوانگ دیکھنے جا رہے تھے۔ تو انہیں راستے میں چھلاوا مل گیا تھا اور ان سے دوستی بھی گانٹھ لی تھی۔ جب وہ لال گڑھی کی پلیا پر پہنچے تو چھلاوے نے پوچھا۔
"کیا لال گڑھی کے ہی رہنے والے ہو؟"
کلو چاچا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"نہیں میں تو سوانگ دیکھنے آیا ہوں۔"
اب چھلاوے نے ان کو بہکانا شروع کیا۔
"تمہیں کسی نے غلط خبر دی ہے۔ لال گڑھی میں کوئی سوانگ نہیں ہے۔"
کلو چاچا نے کہا۔
"مگر نگاڑے کی آواز تو آ رہی ہے۔"
یہ تو تمہارے کان بج رہے ہیں۔ میرے ساتھ چلو، اس سے اچھی آوازیں سناؤں گا۔"

کلّو چاچا ڈر گئے اور چھلاوے کا قد کئی گز لمبا ہو گیا۔ وہ لال گڑھی کی طرف بھاگے مگر چھلاوا دیو کی طرح سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کلّو چاچا کو اٹھا اٹھا کر پٹخنیاں دینے لگا۔ جوں جوں پٹخنیاں دیتا، چھلاوے کا قد چھوٹا ہوتا جاتا۔ چھلاوے نے کلّو چاچا کو اتنی پٹخنیاں دیں کہ بے چارے بے ہوش ہو گئے۔ صبح کسی راہ گیر نے اٹھا کر گھر پہنچا دیا۔ ہوش آتا تو واقعے کی تفصیل ہر ایک کو بتاتے اور پھر بے ہوش ہو جاتے۔ وہ تین دن بھی نہ جینے پائے کہ آگ کی بھینٹ ہو گئے۔ گاؤں والوں کا خیال ہے کہ اس برگد پر، جس سے کالا آدمی اترا تھا، کلّو چاچا کی روح رہتی ہے اور وہ بھوت بن گئے ہیں۔

''اچھا تو تو کلّو چاچا کی روح ہے۔''

وہ شخص اپنا منہ نوچنے لگا' پھر افسوس کے لہجے میں بولا۔

''کاش تم مجھے پہچان لیتے۔''

''پہچان۔''

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کالا آدمی اس میں سما جانے کے لیے آگے بڑھا مگر وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔

رات کی سیاہی نے انگڑائی لی تو کالے آدمی کا چہرہ دمکنے لگا۔ دمکتے چہرے سے ڈر کر اس نے کہا۔

''میں تجھ سے نہیں ڈروں گا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ سدھ پور کے سرپنچ نے جب اپنے ساتھ کئی لٹھیتوں کو لے کر مجھ پر چڑھائی کی تھی تو میں اپنے کھیت میں اکیلا ہل جوت رہا تھا۔ میں نے جم کر مقابلہ کیا۔ ان ہی میں سے ایک کی لاٹھی چھین کر وہ داؤ دکھائے کہ سب کے سب چوکڑی بھر گئے۔ کہتے تھے یہ زمین ان کی ہے۔ زمین تو میری ہے، اس لیے کہ اس پر میرا قبضہ ہے۔''

یہ سچ ہے پورے علاقے میں کسی کی ہمت نہیں تھی جو اس سے مقابلہ کرتا۔ بس ایک فتّے باولا ہی تھا جو اینٹ لے کر اس کے پیچھے دوڑ جاتا تھا۔ کئی بار تو اس کا سر بھی پھوڑ ڈالا تھا فتّے نے۔

''فتّے ——'' اس کے منہ سے نکلا۔ یہ سنتے ہی کالے آدمی کے چہرے پر مزید چمک آ گئی اور آنکھیں نکل پڑنے کو بے چین نظر آنے لگیں۔ اس نے دیکھا تو

کانپ گیا اور برگد کے نیچے سے ہوتا ہوا گاؤں کے دگڑے پر آ گیا۔ مڑ کر دیکھا، کالا آدمی پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا، اور تیز چلا، پھر بھاگنے لگا۔ گاؤں رات کی تاریکی میں ڈوبا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب اس نے بھنگیوں کے گھورے دیکھے تو سانس لی اور دل کو تھپکی دی کہ اب گاؤں تھوڑی ہی دوری پر ہے۔ وہ رکا، پلٹ کر دیکھا، کالا آدمی اس کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر جو بِتّی بھری تو کنّا جاٹ کے دروازے پر جا کر رکا۔ چھپّر میں رکھی اناج کی بوریاں دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں۔ مگر کالا آدمی چھپر کی تھونی سے لگا اس طرح کھڑا تھا جیسے پہرا دے رہا ہو۔ اب وہ جہاں جاتا کالا آدمی دیوار بن کر سامنے موجود ہوتا۔ بال کشن سُنار کی منڈیر پر، ٹھگوں کی چوپال میں، جہاں راہ گیروں کو لوٹنے کی یوجنائیں بن رہی ہوتیں، یا پھر اس کنویں کے من کے آس پاس جہاں گوریاں پانی بھرنے آیا کرتی تھیں اور وہ اپنے منچلے ساتھیوں کی مدد سے انہیں ......، یا بھودیو کی بھینسوں کے قریب جو ہمیشہ بغیر احاطے کے گھیر میں بندھا کرتیں۔ کالا آدمی ہر جگہ موجود ہوتا۔ یہاں تک کہ حاجی دلاور خاں کے چھجے پر، دِبّو ساہوکار کی دکان کے چبوترے پر اور بھگوان داس کے مکان کے پچھواڑے، جہاں آج سیندھ لگانے اسے اپنے ساتھیوں کے سنگ آنا تھا۔

"ساتھی ــــ"

وہ تو نٹی کی قبر کے پاس میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

وہ مڑا ــــ

"اُف یہ کالا آدمی یہاں بھی موجود ہے۔"

وہ بھاگا، بھاگتا رہا اور بھاگتے بھاگتے گاؤں سے باہر قبرستان میں جا پہنچا، جب اس نے کالے آدمی کو قبرستان کی بیریوں میں بھی کھڑا پایا تو بے ساختہ بول پڑا۔

"میں تجھ سے نہیں ڈروں گا۔"

کالا آدمی اس کی جانب لپکا۔

"تو پھر مجھے اپنے اندر سما جانے دو کہ میں کبھی تمہارا..............."

اس نے کالے آدمی کو غور سے دیکھا۔

"ارے اسے تو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

ذہن پر زور ڈالا ——— ''یہ کالا آدمی .... کالا؟ نہیں ——— اس کے چہرے پر بلکہ پورے جسم پر سفیدی تیر رہی ہے۔ پھر مجھے یہ کالا کیوں دکھائی دے رہا تھا؟ اس نے شاید ٹھیک کہا تھا، میری بینائی ہی کالی ہے۔''

اسے یاد آیا کہ نروتن اونٹ گاڑی والا جب دو بجے رات میں ہی اپنی شکرم لے کر گنگاپور کی منڈی کے لیے چل پڑا تھا تو یہیں قبرستان میں اسے ایک چھلاوا ملا تھا اور پھر اس کی چھلاوے سے دوستی بھی ہوگئی تھی۔ چھلاوا اونٹ کے لیے روزانہ نیم کے پتے توڑ کر شکرم کی بالائی منزل پر رکھ جایا کرتا تھا۔

''چھلاوا دوست بھی بن سکتا ہے؟'' اس نے سوچا۔ پھر اس آدمی سے دوستی کرنے کی خواہش پیدا ہوئی جو اُسے اب کالا نہیں، اجلے سویرے کی طرح چمکتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس خواہش کا پیدا ہونا تھا کہ برگد سے اترے آدمی کا قد چھوٹا ہونے لگا اور پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کا اپنا قد بڑھتا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھی ——— سرپنچ کی زمین پر قبضہ ——— دس دس کوس بندھی دھاک ———

''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

اسے پھر اس آدمی کا چہرہ بلکہ پورا جسم سیاہ نظر آنے لگا۔ وہ ڈر گیا، بالکل اسی طرح جیسے فتئے باولے کو دیکھ کر ڈر جایا کرتا تھا، اور پھر پرانے مندر کی طرف دوڑ پڑا۔ وہاں سے عید گاہ کا رخ کیا، آخر کار ایک پرانی اور ویران کوٹھی پر جا پہنچا۔

بادل ——— کالے بادل ——— تیز ہوا ——— ہوا کی سنسناہٹ اور خوف کی گٹھری کو ڈھوتا ہوا جب وہ کوٹھی کی سیڑھیوں کے قریب پہنچا تو اسے کالا آدمی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا ملا۔ اب کالے آدمی کا قد اور بھی کم ہو گیا تھا اور اس کا اپنا قد بہت بڑھ گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ اس کا اپنا جسم نہیں بلکہ وہ برگد کا درخت ہے، جس سے کالا آدمی اترا تھا۔ اس کے بدن میں سرسراہٹ ہوئی تو اسے لگا کہ وہ آدمی برگد کے پیڑ پر ....

برگد کے پیڑ پر؟

ہاں اس کے اپنے جسم پر چڑھ رہا ہے۔ وہ دہاڑا۔

''میں تجھ سے نہیں ڈروں گا۔ میں تجھ سے نہیں ڈرتا۔ تجھے اپنے اندر سما

سکتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی کالا آدمی غائب ہو گیا مگر ابھی سیڑھیوں پر اس کا سایہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شخص جو اسے اب تک سیاہ دکھائی دے رہا تھا، روشنی بن کر اس کے جسم میں سما چکا ہے۔ اسے اپنے اندر غیر معمولی طاقت کا احساس ہونے لگا۔

رات کا بدن پگھل کر قطرہ قطرہ گر رہا تھا اور پورب کی جانب سفید سائے ابھر آئے تھے۔ سفیدی چھانے لگی تھی اور سیڑھیوں پر نظر آنے والا سایہ مٹنے لگا تھا۔ سایہ جوں جوں مٹتا گیا، اس کے بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں اور خون رگوں میں کلانچیں مارنے لگا۔ اب وہ خود کو چھلاوا اور ساری دنیا کو کلو چاچا سمجھ کر پٹخنیاں دینا چاہتا تھا۔

جب روشنی آسمان سے زمین پر اتر آئی بلکہ زمین سے پھوٹ کر آسمان پر پھیل گئی تو اس نے دیکھا کہ رحیم بخش اپنے کھیت میں ہل جوت رہے ہیں۔ پیچھے سے جا کر سلام کیا۔ رحیم بخش نے مڑ کر دیکھا اور آنکھیں اس طرح موند لیں جیسے سورج ان کی آنکھوں میں اُتر آیا ہو۔ آنکھیں کھولیں، تاب نہ لا سکے، زمین پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ لالتا اپنی باڑی میں سنچائی کر رہا تھا۔ جب اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو پھاوڑا چھوڑ کر گاؤں کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا گاؤں پہنچا تو گاؤں والوں نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ چوپالوں پر بیٹھے بوڑھوں نے چلمیں الٹ دیں۔ حقہ پانی بند ——— مسلمانوں نے کافر جانا تو ہندوؤں نے اپوتر قرار دیا۔

اب اس کے کھیت کو سدھ پور کے سرپنچ جوتتے ہیں اور اپنے مویشی بھی اسی کے گھر میں باندھتے ہیں۔ سب ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں اور وہ گاؤں سے باہر، بھنگیوں کے گھوروں سے پرے، ننّی کی قبر کے پاس، قبرستان کی بیریوں کے کنارے، برگد کے پیڑ کے نیچے ایک جھونپڑی ڈال کر رہتا ہے۔ گاؤں والوں کا خیال ہے کہ وہ مرنے سے پہلے ہی بھوت بن گیا ہے۔ ہاں بس ایک پاگل فتّے ہی ہے جو اسے کھانے کے لیے روکھی سوکھی روٹی دے جایا کرتا ہے۔

○○○

چابیاں

ملبا کریدتے کریدتے اس کے ہاتھ بری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ وہ کئی برس سے ملبے میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے کس چیز کی تلاش ہے؟ یہ تو خود بھی نہیں جانتا مگر اسے لگتا ہے کہ وہ چیز ضرور کسی ملبے کھنڈر یا دلدل میں چھپی ہوئی ہے۔ دلدل کا خیال آتے ہی اس کے پاؤں سخت زمین میں بھی دھنسنے لگتے ہیں۔ اسے تو چلتے رہنا بلکہ دوڑتے رہنا ہی پسند ہے۔ اور کھنڈر.......... ہاں اس نے اپنے اندر اور باہر کے تمام کھنڈر کھنگال ڈالے ہیں مگر بجلی کی طرح تیز، آنکھیں چندھیا دینے والی ایک چمک کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

چمک کی حقیقت جاننے کے لیے اب اسے اندھیروں کی تلاش تھی۔ شہر کی روشنیاں آنکھوں میں سوئیاں بن کے چبھنے لگیں تو وہ دور اندھیرے گھنے جنگلوں کی جانب نکل پڑا۔ چلتے چلتے پاؤں لڑکھڑائے، شاید کسی کھنڈر کا بڑا پتھر راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ منہ کے بل گرا.......... آنکھیں بند ہوئیں اور پھر کھل گئیں۔ اسے محسوس ہوا کہ آنکھیں پہلی بار کھلی ہیں۔

البرٹ..........

"ڈونٹ ڈسٹرب یار، یہ لو اسکاچ۔"

اور اس کی آنکھوں میں ڈسکوتھیک کی مدھم روشنی تیر گئی۔ جلتی بجھتی روشنی......

"روشنی تیز کرو مہاویر۔"

"دیے میں تیل ختم ہو چکا ہے، روشنی اور تیز نہیں ہو سکتی۔"

"کوئی مشعل جلاؤ۔"

"نہیں، یہ پھوس کی کٹیا جل کر راکھ ہو جائے گی، اور یہ راکھ دودھیا گنگا جل کو سیاہ کر دے گی، اور گھاٹ پر نہاتی دوشیزاؤں کے بدن میلے ہو جائیں گے۔"

اس نے اسکاچ کا پیگ چڑھالیا اور صوفے کی پشت سے کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے اونٹوں کی قطار کے اس طرف درختوں پر لٹکی شیریں اور لذیذ کھجوریں۔ اونٹنی کے دودھ سے بھرے پیالے۔ صحرا کی دھول اور آنکھوں پر چھایا اندھیرا۔

"اندھیرا چھٹ گیا۔ کیا مہاویر نے مشعل جلادی؟"

البرٹ نے اپنا سگریٹ سلگانے کے لیے لائیٹر جلایا تھا اور روشنی اس کے چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ البرٹ نے چونک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ کیا! صوفے کا تمام کپڑا نوچ ڈالا؟ اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر یہ کیا تلاش کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں تو پھر چھپر کے بند کیوں کھل گئے ہیں اور کٹیا کا پھوس اس قدر چھدرا کیوں ہو گیا ہے؟"

"مہاویر یہ سچ ہے کہ تمہارے چھپر کے بند کھل گئے ہیں لیکن میرا قطعی یہ مقصد نہیں تھا۔"

"یہ مقصد نہیں تھا تو ابن سعید کے دودھ سے بھرے پیالے کیوں خالی ہو گئے؟ اور کھجوریں؟"

صحرا کی دھول اس کی آنکھوں میں گھس گئی اور وہ گر پڑا۔ منہ کے بل۔ وہ منہ کے بل گرا پڑا تھا۔ نیم بے ہوش۔ مگر اس کے ہاتھ اس حالت میں بھی مٹی کھود کھود کر کچھ تلاش کر رہے تھے۔ پھر اس نے گھٹنوں کو پیٹ کی طرف سمیٹا، بدن کو ڈھیلا، دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے

اور زور لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرا بہت گہرا ہو چکا تھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں، کچھ نظر نہیں آیا۔ ہاں ایک چمک تھی جو بار بار بجلی کی طرح اس کی آنکھوں میں کوند جاتی تھی۔

"اب گھر لوٹ جانا چاہیے۔"

"نہیں .... رات میں ہی تو موقع ملتا ہے۔ دن کی روشنی میں البرٹ، مہاویرا اور اونٹوں والا تاجر ابنِ سعید بھی تو راہ میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔"

مڑ کر دیکھا، شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ سامنے گھپ اندھیرا تھا۔ وہ اندھیرے کی طرف چل دیا۔ کئی جگہ ٹھوکر کھا کر گرا، پھر اٹھا اور بغیر ادھر اُدھر دیکھے سیاہ غار کی جانب چلتا رہا۔ بار بار گرنے سے دونوں گھٹنے چھل گئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔

"اندھیرے میں ڈھونڈنا فضول ہے۔" البرٹ کی آواز آئی۔

"اندھیرے میں تو میں اپنی کٹیا کا راستہ بھی بھول جاتا ہوں۔" مہاویر نے کہا۔

"مہاویر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" تاجر ابن سعید بولا۔ "اندھیرے میں تو میرے تمام اونٹ، چاندی کے پیالے اور کھجوروں کے درخت بھی گم ہو جاتے ہیں۔ اور میں انہیں تلاش کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔"

"مگر مجھے جس چیز کی تلاش ہے، اس کی چمک اندھیروں کو نیست و نابود کر دے گی۔"

"یونانی فلسفیوں کا بھی یہی خیال تھا مگر آج ...."

"نہیں البرٹ، مجھے کسی فلسفے کی تلاش نہیں ہے۔" وہ تقریباً چیخا۔ اس کی چیخ اندھیرے جنگلوں میں دیر تک گونجتی رہی۔ چیخ کی گونج شاید اس کی ماں کے کانوں تک جا پہنچی تھی۔

"بیٹے کیا بات ہے، تم سوتے میں اکثر چیخنے لگتے ہو۔"

"ارے ماں تمہارا دانت .... سونے کا دانت ...."

جب وہ چھوٹا تھا تو اس نے ماں کے منہ پر ایک پتھر دے مارا تھا اور ماں کا ایک دانت ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ ماں کے سارے دانت کتنے چمکتے تھے مگر ایک دانت .... اس نے ماں کے اکھڑے ہوئے دانت کو بہت ڈھونڈا۔ ماں کے سونے کے بعد وہ اٹھ کر گھر کے کوڑے میں دانت ڈھونڈا کرتا۔ ایک مرتبہ مہترانی کے ٹوکرے میں اسے کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی اور وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ دھپ سے ماں کا ہاتھ پیٹھ پر پڑا اور وہ بلک کر رہ گیا۔ پھر اس کے باپ نے

ماں کے سونے کا دانت لگوا دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ماں کے ٹوٹے ہوئے دانت کو ڈھونڈتا رہتا۔ کیا آج بھی وہ اسی دانت کو تلاش کر رہا ہے؟ نہیں ...... بھلا اب وہ دانت کا کیا کرے گا؟ تو پھر ...... ؟ نہ جانے اب وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ اسے اپنے اندر ہر وقت بے چینی سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی کسی بھی چیز سے مطمئن نہیں ہے۔ اگر اسے کچھ ملتا بھی ہے تو وہ ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ کوئی بہت بڑی چیز؟ مگر ہر چیز سے کوئی دوسری چیز بڑی ہے، اور جو سب سے بڑی ہے اس سے وہ بہت چھوٹا ہے۔ تو پھر وہ چمک ...... ؟ ہاں وہ چمکدار چیز کیا ہے؟ اس کی ماں کا دانت؟

"ماں تمہارا سونے کا دانت کیا ہوا؟"

ماں نے گردن جھکالی۔

"بیٹے کھانا ...... کھانا کھالو بیٹے، کئی دن سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔"

سونے کا دانت اس کے حلق میں اٹک گیا۔ کھنکارا، پانی پیا اور جب دانت کو پوری طرح نگل گیا تو اس کی ماں سو چکی تھی۔ اب اس کی ماں ہمیشہ کے لیے سو چکی ہے۔ "البرٹ مطمئن ہے، مہاویر نے کٹیا کا پرانا چھپر بدلوالیا ہے اور ابنِ سعید ...... ؟ وہ تو دو چار اونٹوں اور کچھ کھجور کے درختوں کو ہی بہت کچھ سمجھتا ہے۔ مگر میں ......"

جب اندھیرے جنگلوں میں چیخ کی گونج گم ہوگئی تو اس کے ہاتھ پھر ملبا کریدنے میں محو ہوگئے۔ اب اس کے ہاتھ بری طرح زخمی ہوگئے تھے۔ دوپٹا یا شاید اسکارف یا پھر مٹی میں سنے ساڑی کے پھٹے آنچل کی طرح کا کوئی کپڑا اس کے ہاتھ لگ گیا۔

"ماں۔" اس کے حلق سے نکلا اور پھر اپنے لہولہان ہاتھ اس کپڑے کے ٹکڑے سے پونچھنے لگا۔ چاند کی ہلکی روشنی میں اس نے دیکھا، یہ کھنڈر ...... یہ ملبا ...... اس کے اپنے مکان کا ملبا ہے۔ اس نے اپنے گھر کے تمام صوفوں کو نوچ ڈالا ہے، الماریوں کو توڑ دیا ہے اور جگہ جگہ سے زمین کھود ڈالی ہے۔ پھر بھی ناکامی۔ کتنی ہی مچھلیوں کے پیٹ چیرے ہیں تو کئی دیواروں کو گرایا ہے مگر اسے وہ نہ مل سکا جس کی چمک آنکھوں میں برچھیاں چبھو رہی تھی۔

وہ ڈسکوتھک میں بیٹھا اسکاچ کے پیگ چڑھا رہا ہے۔ انگلی میں البرٹ کی دی ہوئی چاندی کی انگوٹھی ہے۔ گلے میں مہاویر کی جنیؤ اور ہاتھ میں ابن سعید کا نقشیں پیالہ۔ چاندی کی انگوٹھی، مہاویر کی جنیؤ اور نقشیں پیالہ۔ البرٹ مہاویر اور ابنِ سعید ...... مگر وہ خود کہاں ہے؟ اس نے البرٹ کا خون کر دیا اور انگلی سے چاندی کی انگوٹھی غائب ہوگئی۔ جب مہاویر کو ختم کیا تو جنیؤ

بھی مہاویر کی جھونپڑی کے ساتھ جل کر راکھ ہوگئی، اور جب ابنِ سعید کے گلے میں اس کی مضبوط انگلیاں پیوست ہوئیں تو نقشیں کٹورا اس طرح غائب ہوگیا جیسے ماں کا دانت ٹوٹ کر غائب ہوا تھا۔

اب وہ بالکل تنہا تھا۔ چمکیلی چیز کی تلاش رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ رفتار تیز ہوئی کہ لڑکھڑایا، گرا، سنبھلا اور پھر گر گیا۔ مگر اس دفعہ جب آنکھیں کھولیں تو دور کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اٹھا اور دوڑنے لگا۔ دوڑتا رہا۔ بہت تھک چکا تھا، سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ حلق بالکل خشک ہوگیا تھا جیسے اس میں کانٹوں کی جھاڑیاں اگ آئی ہوں۔ اب وہ چمک کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ہانپتا ہوا ایک پتھر پر بیٹھ گیا، پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیے۔ ہاتھ میں کوئی نکیلی چیز چبھی تو وہ اچھل گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ٹٹول کر دیکھا، تانبے کی ایک صندوقچی تھی۔ آنکھیں کھولیں اور انگلیوں سے مٹی کھرچ کھرچ کر صندوقچی کو زمین سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

''بہت بھاری ہے۔''

خوشی سے نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ صبح ہو رہی تھی اور روشنی آسمان پر پھیلنے لگی تھی۔

''کتنے تاریک یگوں کے بعد آج صبح ہوئی ہے۔''

اس نے سوچا اور صندوقچی کھولنے لگا۔ سورج کی پہلی کرن صندوقچی کے اندر داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ صندوقچی میں بے شمار چابیاں چمک رہی تھیں۔ غور سے دیکھا چابیوں کے علاوہ چاندی کی چھڑی میں لپٹا ایک ریشمی کپڑا بھی تھا۔ جس پر سنہرے حروف سے لکھی ایک عبارت درج تھی۔

> ''یہ چابیاں جن کی تعداد دو ہزار ہے، ایک ایسے محل کی چابیاں ہیں جو یہاں سے ہزاروں میل دور مشرق میں واقع ہے۔ محل میں داخل ہونے کے لیے سو دروازے عبور کرنے ہوں گے، ہر دروازے میں دس تالے ہیں اور ہر تالا دو چابیوں سے کھلتا ہے۔''

ابھی سانس قابو میں آنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ پھر بھاگنے لگا، صندوقچی لیے مشرق کی

جانب۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر کیفیت میں بھاگ رہا تھا، بہت تیز۔ بھاگتے بھاگتے اب وہ اپنے شہر سے بہت دور نکل آیا تھا۔

جب وہ اگلے شہر میں داخل ہوا تو اس کی ماں کی آخری نشانی سونے کی ایک موٹی زنجیر اس کے گلے سے کھل کر پیروں کی طرف سرکی، رکاب بنی اور وہ کود کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ ٹراٹ .... گیلپ اور پھر باگ اتنی ڈھیلی کر دی گئی کہ گھوڑے کی نعلیں گھس گئیں اور چاروں پیر زخمی ہو گئے۔ پہاڑی راستوں پر لگی کائی اور گھوڑے کے پھسلنے کا خوف۔ وہ اترا اور لگام کا کڑا پکڑ کر دوڑنے لگا۔ اب میدانی علاقہ آ چکا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار اپنی منزل ....

'منزل۔؟'

'ہاں دو ہزار چابیوں والا محل۔'

'کیا وہ کبھی منزل پا سکے گا؟'

اس نے گھوڑے کے چابک مارا۔ گھوڑے نے ہنہنا کر اگلی ٹانگیں اوپر اٹھائیں اور پھر بری طرح لنگڑانے لگا۔

'اس نے اپنے جھولے سے ہتھوڑی، نعلیں اور کچھ کیلیں نکالیں۔ گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ وہ رکاب میں پاؤں پھنسا کر سرکس کے رنگ ماسٹر کی طرح گھوڑے کے پیروں کی طرف جھک گیا۔ نعل کے سوراخ میں ایک کیل پھنسائی۔ جیسے ہی قدم بڑھانے کے لیے گھوڑے نے پیر اٹھایا، اس نے بڑی مہارت سے کیل ٹھوک دی۔ دوبارہ پیر اٹھایا تو دوسری کیل اور پھر تیسری۔ اس طرح اس نے چاروں پیروں میں نعلیں ٹھوک دیں۔'

گھوڑا لنگڑا رہا تھا، اسے ہنسی آئی، وہ ہنسی نہ روک سکا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"اگر میں اپنے ساتھ نعلیں اور کیلیں لے بھی آتا تو کیا اس طرح چلتے گھوڑے کے ...... نہیں۔"

اسے محسوس ہوا کہ ہاتھ پاؤں سن ہوتے جا رہے ہیں۔ چابک کا وزن کئی من ہو گیا ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھایا تو لگا، ہاتھ پر ایک پہاڑ ہے اور اس پر سنجیونی جل رہی ہے۔ جیوتی جسم میں

اتر آئی ، بازو کی مچھلیاں پھڑکیں ، ہاتھ تیزی سے چلنے لگا اور اس نے گھوڑے کے لگا تار کئی چابک مارے مگر اب گھوڑا بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

کوئی شخص پرانی موٹر گاڑی پر سوار سامنے سے آرہا ہے۔

''البرٹ!''

''البرٹ کو تو میں نے قتل کر دیا تھا۔''

وہ شخص اب اس کے بالکل قریب آن پہنچا تھا۔

''البرٹ ہی ہے۔مگر یہ تو.......... یہ کمبخت ہمیشہ میری مخالف سمت میں سفر کرتا ہے اور بار بار سامنے آ کر راستہ روکتا ہے۔وہ میرے اتنا قریب آن پہنچا ہے پھر بھی ہم ٹکرا کیوں نہیں رہے؟ کیا میں پیچھے لوٹنے لگا ہوں یا ہم دونوں اپنے اپنے مقام پر ٹھہر گئے ہیں۔''

اس نے گھبرا کر گھوڑے کے ایڑ لگائی ۔ جگہ جگہ سے ٹوٹی اور رنگ اڑی موٹر پر بیٹھا البرٹ مسکرا رہا تھا۔

''البرٹ بھی خوب ہے، ہر چیز پر قناعت کر لیتا ہے۔یہ اُدھر کیا دیکھ رہا ہے۔البرٹ کہاں اُدھر تو میں دیکھ رہا ہوں۔''

اور اس نے دیکھا کہ ابنِ سعید اونٹ پر آہستہ آہستہ سفر کرتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

''ایں یہ بھی زندہ ہے اور مہاویر؟''

'چھن چھن.......... رتھ کی سواری بھی کیا خوب ہوتی ہے۔بیلوں کے گلے میں بندھی ننھی ننھی گھنگرو نما گھنٹیاں۔اور دھیمی دھیمی بیلوں کی مست چال۔'

اب اس کے قریب ایک رتھ آ کر رکا، دیکھا رتھ کے اندر مہاویر بیٹھا اسے گھور رہا ہے۔

''نہیں، البرٹ ابنِ سعید اور مہاویر میرا راستہ نہیں روک سکتے۔وہ مردہ ہیں۔میں انہیں قتل کر چکا ہوں۔'' اس نے دونوں آنکھیں موند لیں۔گھوڑا لنگڑاتا ہوا رفتہ رفتہ مشرق کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اچانک منہ کے بل آن گرا۔

گھوڑے کے چاروں پیر پہاڑ کی پتھریلی زمین سے چھل چھل کر بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔وہ جیب سے رومال نکال کر کھروں سے خون پونچھنے لگا۔پوٹلی میں مرہم دان ٹٹولا مگر اس میں دو چار کپڑے، چابیوں کی صندوقچی اور کچھ نقدی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔سوچا اگر

شام ہوتے ہوتے جنگل سے باہر نکل پایا تو اگلی بستی پہنچ کر کچھ سامان خریدے گا۔ لیکن اس کا گھوڑا۔ وہ تو اب اٹھنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ گھوڑے کی ٹانگوں کو سہلانا شروع کیا، پھر اس کی کمر، گردن اور رانوں پر مالش کرنے لگا۔

''شاید گھوڑے کو پیاس لگی ہے۔''

دراصل وہ خود بہت پیاسا تھا۔ چاروں کھونٹ نظر دوڑائی کہ جنگل سے کوئی دریا گزرا ہو اور جانور پانی پینے اس طرف جا رہے ہوں۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دور تک گھنے پیڑوں کے سائے اور کچھ بھی نہیں۔

''ذرا ادھر اُدھر چل کر دیکھنا چاہیے شاید جنگل میں کوئی چھوٹی سی بستی ہو۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، چابیوں کی صندوقچی اٹھائی اور پانی کی تلاش میں چل پڑا۔ جنگل میں بھٹکتے ہوئے کئی پہر گزر گئے۔

''تھوڑا سا پانی مل جاتا تو..........''

''یہ لو اسکاچ۔''

''نہیں البرٹ، میری پیاس تمہارے چھوٹے سے گلاس سے نہیں بجھے گی۔ مجھے دریا کی تلاش ہے۔ وہ دیکھو جانور اس جانب جا رہے ہیں، وہاں پانی ضرور ہوگا۔''

البرٹ پیگ لیے سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے پیگ لے لینا چاہیے۔ اگر دریا نہ ملا تو......؟'' وہ سوچ رہا تھا۔

''دریا ضرور ملے گا۔ دریا اسی کو ملتا ہے جسے دریا کی تلاش ہو۔ ابنِ سعید کے اونٹ تو صحراؤں میں چلنے کے عادی ہیں اور مہاویر، وہ تو بہتے پانی کو بھی بوتل میں قید کر کے رکھتا ہے۔ میری بات اور ہے۔ مجھے دریا کی تلاش ہے، دریا ضرور ملے گا۔''

وہ بھٹکتا رہا، جانوروں کے پیچھے بہت دور تک گیا مگر پانی نہ مل سکا۔

''تو کیا ہوا؟ آج نہیں تو کل۔ انتظار کرنا ہمت ہارنے سے بہتر ہے۔''

اب وہ گھوڑے کے پاس واپس آ چکا تھا۔ گھوڑے کی حالت پہلے سے کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔ گھوڑے کی گردن سہلائی، رانوں پر ہاتھ پھیرا اور پشت کو زور زور سے تھپتھپایا۔ گھوڑے نے پھریری لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ باگ پکڑے پیدل چلنے لگا۔ سورج غروب ہونے والا تھا مگر جنگل۔

"ہزاروں میل دور مشرق میں ایک محل ہے۔ کیا وہ کبھی وہاں پہنچ سکے گا۔ کیا واپس لوٹ جانا چاہیے؟ واپس! نہیں، اب تو وہ البرٹ، ابن سعید اور مہاویر کو بھی قتل کر چکا ہے۔ اور اس کی ماں، اس کا گھر۔ ماں کی سونے کی زنجیر.......... ان سب کے بدلے یہ بیمار گھوڑا، یہ لنگڑا گھوڑا۔ مجھے کیا کرنا ہے، اب تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

سورج غروب ہوئے دیر ہو چکی تھی اور اندھیرے نے جنگل میں پاؤں پسار دیے تھے۔

"لگتا ہے رات جنگل میں ہی کاٹنی پڑے گی۔ مگر جنگلی جانور؟"

وہ سہم گیا اور قدم خود بخود مشرق کی جانب تیز تیز بڑھنے لگے۔

"رات بھر سفر کرنا جنگل میں ٹھہرنے سے اچھا ہے۔"

اور وہ چلتا رہا۔ دفعتاً ٹھٹکا اور رک گیا۔

"کہیں میری سمت اندھیروں میں گم تو نہیں ہو گئی؟"

"نہیں۔" ذہن پر زور ڈالا۔ "بغیر کسی جانب مڑے سفر کرتا رہا ہوں۔ جغرافیے کا طالب علم نما بھلا اپنی سمت کیسے بھول سکتا ہوں۔"

چلتے میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"آنکھیں کھولنے سے بھی کیا فائدہ۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

پنڈلیوں کی نسیں اکڑ چکی تھیں۔

"کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔" اس نے سوچا اور ایک درخت کے تنے سے گھوڑا باندھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ نیند آ رہی تھی۔ اس نے تنے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور درخت کے تنے سے کمر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

⇐ دونوں طرف کانٹوں کی بڑی بڑی جھاڑیاں ہیں۔ درمیان سے بہت پتلی سی پگڈنڈی گزر رہی ہے۔ ذرا بھی ادھر اُدھر ہوتا ہے تو بدن میں بے شمار کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ کس قدر دشوار راستہ ہے۔ پگڈنڈی میدان بن گئی۔ سامنے سے ہاتھی آ رہے ہیں۔ منہ شیر کی طرح ہیں اور پاؤں انسانوں کی مانند۔ وہ اس کے بہت قریب آ چکے ہیں۔ ان میں سے ایک اس کے سامنے کھڑا ہے، آدمی کی جون میں۔ وہ پوچھتا ہے۔

''اِدھر کوئی محل ہے، دو ہزار چابیوں والا محل؟''

وہ شخص کوئی جواب نہیں دیتا مگر ایک آواز آتی ہے۔

''ہاں ادھر مشرق کی طرف چند پڑاؤ بعد ایک محل ہے۔ دو ہزار چابیوں والا محل۔''

وہ چل دیتا ہے۔ منزل بہ منزل۔ اب وہ کچھ اجنبی کچھ آشنا گاؤں کی گلیوں سے گزر رہا ہے۔

''ارے یہ گھر تو میرا دیکھا ہوا ہے۔''

اور وہ سنسان مکان میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہُو کا عالم۔ ہوا کی سنسناہٹ۔ درو دیوار ہیں بھی اور نہیں بھی۔

''یہ گھر کہیں دیکھا ضرور ہے۔''

آنگن کے وسط میں سنگ مرمر کا ایک حوض ہے، جو شفاف پانی سے لبریز ہے۔ جب وہ کنارے پر کھڑے ہو کر پانی میں اپنا عکس دیکھتا ہے تو حیرت سے اچھل پڑتا ہے۔ وہ، وہ نہیں ہے ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔ اپنے بچپن والا وہ خود۔ نانی اماں کہانی سنا رہی ہیں۔ سوئیوں والے مردہ شہزادے کی کہانی۔

''ارے یہ وہی گھر تو ہے، نانی اماں کی کہانی والا۔'' جب بھی نانی اماں کی کہانی میں پردیس کے کسی گھر کا ذکر ہوتا تو اس کی نظروں میں ایسے ہی گھر کا نقشہ گھوم جایا کرتا تھا۔ صحن کی دیوار میں ایک گھڑونچی بنی ہے۔ اس پر پانی بھرے کئی گھڑے رکھے ہیں، جو ابن سعید کے سفید نقشیں کٹوروں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اسے لگا کہ کٹورے چاندی کے ہیں۔

''چاندی کے! ابن سعید ایک معمولی تاجر اور کٹورے چاندی کے۔'' اس نے دیکھا، کئی جگہ سے قلعی اڑ چکی تھی اور تانبا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ کٹورے میں پانی انڈیلتا ہے۔ کئی کٹورے پانی پی گیا ہے لیکن پیاس بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ پھر اس نے گھڑے سے منہ لگا دیا۔ پورا گھڑا خالی ہو گیا ہے۔ پیٹ پانی سے پھٹا جا رہا ہے مگر حلق بالکل خشک ہے۔ وہ دوسرے گھڑے کی جانب بڑھنا چاہتا ہے۔ لیکن پورا جسم شل ہو گیا ہے۔ زمین ہل رہی ہے، شاید اس کے پیر دلدل میں دھنستے چلے

جا رہے ہیں۔ جسم کو آگے دھکیلنے کی کوشش کی مگر بدن میں بالکل جنبش نہ ہوئی۔ شاید اس کے پیچھے کوئی شخص کھڑا ہے۔ اسے الجھن ہونے لگی اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو دیوار سے ٹکا کر آگے بڑھنے کا جتن کرنے لگا۔ وہ ہزاروں ہاتھیوں سے بھی زیادہ بھاری ہو گیا ہے۔ رسّی ایک لمبی رسّی۔ سمجھ میں نہ آیا یہ رسّی کہاں سے آ گئی۔ اس نے رسّی کو پکڑ لیا اور اسے کھینچ کھینچ کر آگے بڑھتا رہا۔

''یہ شخص کون ہے جو میرے پیچھے کھڑا ہے۔ بلکہ مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہے۔''

پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں ایک عالی شان عمارت تھی۔ محسوس ہوا کہ جسم ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے پورا زور لگا کر اوپر اٹھنے کی کوشش کی اور وہ فضا میں تیرنے لگا۔ وہ بہت دیر تک اڑتا رہا۔ اب وہ بلندی پر پہنچ چکا ہے اور عمارت اس کے نیچے ہے۔ وہ رکنا چاہتا ہے لیکن کیسے رکے، اس کا خود پر قابو نہیں ہے۔ اس نے دیکھا، بالکل سامنے عمارت کا گنبد ہے۔ گنبد پر بہت سی چڑیاں بیٹھی چہک رہی ہیں۔ کان پھٹے جا رہے ہیں۔ گنبد آنکھوں کے بہت نزدیک آ گیا ہے۔ رکنے کے لیے دم لگاتا ہے، مگر اس کے ہاتھ پاؤں جیسے اس کے نہ ہوں، ان پر اس کا کوئی بس نہیں ہے۔ آخر کیا کرتا، اس نے خود کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ گنبد اور اس کے درمیان کا فاصلہ مٹ گیا۔

'کیا وہ گنبد سے ٹکرا جائے گا؟' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر دھڑام سے گنبد سے جا ٹکرایا ⟸

جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ درخت پر بہت سی چڑیاں بیٹھی چہک رہی ہیں۔ صبح ہو گئی تھی اور آسمان پر روشنی پھیل چکی تھی۔ آنکھیں ملیں اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامان گھوڑے پر لادا، گھوڑے کی باگ پکڑی اور پیدل مشرق کی سمت چل پڑا۔ کئی گھنٹے کی مسافت کے بعد جب اسے جنگل میں ایک دریا نظر آیا تو خوشی سے جھوم اٹھا اور دوڑ کر کنارے پر اوندھے منہ جا گرا۔ خالی پیٹ پانی پینے سے اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ گھوڑے کو پانی پلا کر آگے بڑھا تو دیکھا کچھ درختوں پر پھل لدے ہوئے ہیں۔

''میری منزل آسان ہو گئی۔'' اطمینان کی سانس لی، تر و تازہ ہو کر جب سفر شروع کیا

تو رفتار میں بلا کی تیزی تھی۔ لگتا تھا لمحے بھر میں اپنی منزل پر جا پہنچے گا۔ مگر جنگل، وہ تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

"کیا زندگی بھر یوں ہی بھٹکتا رہوں گا۔"

اسے یاد آیا ابن سعید جب مہاویر کا کمبل اوڑھ کر البرٹ سے ملنے سفر پر نکلا تھا تو کن کن دشواریوں کا سامنا کیا تھا۔ "راہ میں موضع طور ملا، وہاں پہنچا اور اونٹ پر سوار ہو کر کوہِ طور چلا۔ طور سے کوہِ طور تک چار روز کی راہ تھی۔ راستے میں بلندی سے نشیب میں بہتا ایک چشمہ نظر آیا، وہیں ایک کھجور کا درخت تھا۔ دیر تک وہاں بیٹھ کر ستایا۔ جب کوہِ طور پہنچا تو پھولا نہ سمایا۔ پہاڑ کے اوپر ایک قلعہ بنا تھا، وہیں ایک مکان گنبد دار تھا۔ حضرت موسیٰ اسی جگہ روشنی اور تجلیِ خدا دیکھ کر سجدے میں گرے تھے۔ وہ پتھر دیکھا جس پر حضرت موسیٰ کی پیٹھ کا نشان تھا۔ کیا کیا عجائبات دیکھے اور پھر سفر کے لیے کمر بستہ ہوا۔" (عجائباتِ فرنگ)

یہ واقعہ یاد آتا تھا کہ اس نے بھی اپنے اندر بے پناہ قوت محسوس کی اور کئی روز تک دن رات سفر کرتا رہا۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں، پیر کے تلووں کی کھال پلٹ گئی تھی اور رانوں سے لے کر پنڈلیوں تک جیسے لوہے کی سلاخیں ڈال دی گئی ہوں۔ اب گھٹنوں نے مڑنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ چلتا رہا...... ہفتوں...... مہینوں...... جنگلوں میں...... میدانوں میں...... پہاڑوں پر۔ راستے میں بستیاں ملیں، راہ زن ملے، سپاہی ملے کہ تین پیادے کوتوالی کے آ کر پوچھنے لگے۔

"تم کون ہو۔ کیا پیشہ رکھتے ہو۔ کہاں سے آئے کہاں جاتے ہو۔"

"میں مسافر ہوں۔ مغرب سے آیا ہوں مشرق کو جاتا ہوں۔ تم کو میرے پیشے اور مقامِ سکونت سے کیا کام، اس سے کیا غرض وانجام۔"

عزم بالجزم۔ آگے بڑھتا رہا۔ کئی دفعہ گھوڑے کی نعلیں بدلوائیں اور پھر گھس گئیں لیکن اس نے اپنا سفر جاری رکھا، مشرق کی جانب، دو ہزار چابیوں والے محل کی طرف کہ اچانک نظر اٹھا کر دیکھا، دور نیلا سمندر نظر آ رہا تھا۔

"کیا یہ زمین کا آخری سرا ہے؟"

"اگر یہی زمین کا آخری سرا ہے تو میری منزل؟"

اس نے غور سے دیکھا ساحل پر کچھ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

"شاید کوئی بندرگاہ ہے۔"

بندرگاہ پر پہنچ کر اس کی رانوں کی گرفت سے گھوڑے کی پیٹھ پھسل گئی، ہاتھ سے لگام چھوٹی، گھوڑا بازار میں جا کھڑا ہوا اور وہ سمندر کے سفر کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

''جہاز کا سفر کتنا پر کیف ہے۔''

اس کا گوشہ کپتان کے کیبن سے متصل تھا۔ کھانے پینے کا مکمل انتظام۔ وہ اٹھا اور مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ پانی کا مدھم سنگیت کانوں کو بھلا معلوم ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی لہریں اسے بہائے لے جا رہی ہیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں بند کیں تو آنکھوں کے ڈھیلوں میں گدگدی ہوئی اور پانی کے چند قطرے نکل کر پلکوں پر جم گئے۔

دودھیا بادلوں میں تیرتا ہوا وہ محل کے دروازے پر پہنچ چکا ہے۔ تمام تالے کھول کر جب آخری کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑے اور عالی شان کمرے کی دیواروں پر اس کی اپنی تین تصویریں آویزاں ہیں۔ ایک تصویر کے قریب جا کر غور سے دیکھا، تصویر خون سے بنائی گئی تھی۔ تصویر کے قدموں میں البرٹ کا کٹا ہوا سر رکھا ہے اور گردن سے پھوٹتا خون کا فوارہ تصویر کو رنگین بنا رہا ہے۔ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا اور دوسری تصویر کی طرف مڑا تو دیکھا، وہ ابن سعید کی لاش پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اور جب اس کی نظر تیسری تصویر پر پڑی تو دیوار پر آگ کی لپٹیں نظر آئیں۔ مہاویر کی جھونپڑی جل رہی تھی اور آگ کی روشنی میں اس کا اپنا چہرہ دمک رہا تھا۔ بائیں جانب صندل کی ایک خوبصورت الماری رکھی تھی۔ اس نے الماری کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں گھس گئی، وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگا کہ اس کی آنکھ کھل گئی

سمندر کا سفر جاری تھا۔ وہ بار بار نیلے پانی پر دور تک نظر ڈالتا، جی چاہتا کہ پانی میں کود پڑے اور جلدی سے تیر کر سمندر پار کر لے۔

''یہ سفر کب ختم ہوگا؟'' اس نے سوچا اور مہینوں تک یہی سوچتا رہا کہ ایک روز وہ سمندر کے اس پار ساحل پر تنہا کھڑا تھا۔ اب اس کے پاس نہ گھوڑا تھا نہ نقدی۔ صرف دو ہزار چابیوں والی صندوقچی تھی جسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

''اپنا وطن۔'' اس نے مڑ کر دیکھا دور تک سمندر کا نیلا پانی پھیلا ہوا تھا۔ بے کراں سمندر۔

''کیا میں ہمت ہار چکا ہوں؟''

''نہیں۔''

''تو پھر سینے میں جیوتی کی آنچ دھیمی کیوں ہے؟''

''شاید اس لیے کہ آگے بڑھتے رہنا اب ایک مجبوری ہے۔''

''مجبوری!''

''ہاں، اب پیچھے لوٹنا آگے بڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔''

کئی میل کے سفر کے بعد احساس ہوا کہ وہ بہت بھوکا ہے۔ ابکائیاں آنے لگیں تو وہ ایک ہاتھ سے پیٹ پکڑ کر جھک گیا۔ ایسا کرنے سے کچھ سکون محسوس ہوا تو میلوں تک جھکے جھکے سفر کرتا رہا۔ جب کمر بری طرح دکھنے لگی تو اس نے صندوقچی زمین پر رکھی اور گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور لگایا اور کھڑا ہو گیا مگر پیر لڑکھڑائے اور زمین پر آن پڑا۔ دونوں گھٹنے چھل گئے تھے اور کہنیوں سے خون رس رہا تھا۔ وہ اٹھا اور چلنے لگا لیکن پھر گر گیا اور ماتھا ایک پتھر سے جا ٹکرایا۔

اس کے ماتھے پر جگہ جگہ چوٹوں کے نشان ہیں۔ ہونٹ کتھئی رنگ کی پپڑیاں معلوم ہوتے ہیں اور ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اس میں اٹھنے کی بالکل سکت نہیں ہے۔ کنپٹی کی نسیں زور زور سے پھڑک رہی ہیں۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا، دور کوئی آبادی نظر آئی۔

''شاید کوئی بستی ہے''

اس نے دیکھا، یہ کوئی پرانا قصبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں حرکت باقی نہ رہی تھی مگر نہ جانے کہاں سی ہمت آ گئی۔ جسم کی پوری قوت کو سمیٹا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دوڑ کر قصبے کے سب سے پہلے مکان کے چبوترے پر جا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

کئی روز بعد جب ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ جنگل کی خاردار زمین یا پہاڑ کی ناہموار چٹان کے بجائے نواڑ کے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ دھوئیں کا

ایک غبار تھا جو آنکھ ناک اور منہ میں گھسا جا رہا تھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس لینے میں کافی تکلیف تھی۔ پورے جسم میں جیسے کسی نے سوئیاں چبھو دی ہوں۔ اس نے کروٹ لینے کے لیے جسم کو جنبش دی مگر صرف کراہ کر رہ گیا۔

''کیا میرے اندر آگ سلگ رہی ہے؟''

اسے محسوس ہوا کہ بدن سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ ایک برف کا پہاڑ ماتھے پر آ گرا۔ درد کی شدت کے باوجود اس نے کچھ سکون محسوس کیا۔ کچھ ہی دیر میں برف پگھل گئی اور وہ پہاڑ بھی شعلے اگلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پھر لگا کہ ماتھے پر برف جمتی جا رہی ہے۔

''کتنا سکون ہے، دھواں بھی کم ہے اور گھٹن بھی نہیں۔'' اس نے آنکھیں کھولیں۔

''کیا بارش ہو رہی ہے؟'' اس کا سر پانی سے بھیگا ہوا ہے اور کچھ قطرے کان میں گھس گئے ہیں۔ گردن گھمائی اور دیکھا کہ ایک عورت سرہانے بیٹھی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھ رہی ہے۔

''تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔'' عورت نے کہا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن اندازہ لگایا کہ وہ اسے لیٹے رہنے کی تاکید کر رہی ہے اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ عورت نے ماتھے کی پٹی بدلی اور وہ غنودگی کے عالم میں یوں ہی پڑا رہا۔

چند لمحے بعد ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔ ''پا......'' تھوڑے سے ہونٹ کھلے اور پھر اس نے ''پانی'' کہہ کر اپنا منہ کھول دیا۔ عورت نے حلق میں پانی کی بوندیں ٹپکائیں تو اسے لگا کہ بوندیں اس کے حلق میں نہیں بلکہ جلتے توے پر ٹپکائی گئی ہیں۔ اس نے اوپر کے ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اور۔'' عورت نے تھوڑا پانی اور دیا مگر اس کی پیاس نہ بجھ سکی اور وہ پھر نیم بے ہوش ہو گیا۔

کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ حلق میں کوئی کڑوی سی چیز اتر رہی ہے۔ بے چینی کے عالم میں گردن اِدھر اُدھر گھماتا مگر فوراً ہی اس کے منہ میں کوئی بہت میٹھی چیز ڈال دی جاتی اور وہ اپنے اندر کچھ توانائی محسوس کرتا۔ اب اس کی حالت سنبھلتی جا رہی تھی۔ اس نے کروٹ لی اور دونوں گھٹنوں کو پیٹ کی طرف سمیٹ لیا۔ وہ کچھ بولنا چاہتا ہے، کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر اس سے کچھ نہ بولا گیا اور خاموش پڑا رہا۔ وہ کہاں سے آیا ہے، اسے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ صرف اتنا

معلوم تھا کہ وہ مسافر ہے اور بہت طویل سفر کے بعد یہاں پہنچا ہے۔ پہاڑ، گھنے جنگل، وسیع میدان اور سمندر کو پار کر کے۔

''میری صندوقچی؟'' اسے یاد آیا کہ اس کے پاس دو ہزار چابیوں والی ایک صندوقچی تھی۔ آنکھیں کھولیں اور کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا کہ دروازے سے عورت داخل ہوتی نظر آئی۔

''ارے تم اٹھ گئے!'' وہ پاس بیٹھ کر مسکرانے لگی۔ عورت کی طرف دیکھنے کے بجائے وہ پلنگ کے نیچے جھانکنے لگا۔

''گھبراؤ مت، تمہارا سامان میرے پاس ہے۔''

''اور صندوقچی؟'' وہ جلدی سے پوچھ بیٹھا۔

''کہا نا میرے پاس ہے۔'' عورت بولی۔

''تم کون ہو؟'' اس نے عورت پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

''میں؟ یہ گھر میرا ہی ہے اور تم میرے مہمان ہو۔ تم پردیسی ہو نا؟''

''ہاں۔ تھوڑا پانی پلا دو۔''

عورت نے پانی کا گلاس ہاتھ میں تھما دیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''آج بخار کم ہے۔''

''مجھے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے؟'' اس نے پوچھا لیکن عورت نے جواب دینے کے بجائے کہا۔

''ابھی تمہارے زخم تازہ ہیں اور رات ہو چکی ہے، اب تم سو جاؤ۔''

صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اس کا ہاتھ ماتھے پر گیا، زخموں پر دوا لگی ہوئی تھی اور اب وہ بھرتے جا رہے تھے۔ وہ کتنے دن سے اس عورت کی پناہ میں ہے، اس نے سوچا۔

''کئی روز سے، ہاں شاید ہفتہ بھر ہو گیا ہو یا پھر اس سے بھی زیادہ۔ یہ عورت مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟ کہیں چابیوں پر تو اس کی نظر نہیں ہے۔ اس کی بولی کچھ مختلف ہے مگر بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ شاید اب میں مشرقی علاقے میں داخل ہو چکا ہوں۔ مشرقی علاقہ............ ہاں وہ محل بھی یہیں کہیں ہوگا۔'' وہ اٹھا اور پیر لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''اُٹھ گئے؟'' عورت ایک پیالے میں دودھ لے آئی تھی۔ اس نے عورت کے

ہاتھ سے پیالہ لیا اور بولا۔

''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں تمہیں اس کے بدلے..........''

''کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری حالت خراب تھی۔ تم بچ گئے مجھے خوشی ہے بس۔''

''میں تمہارا احسان مند ہوں۔''

لڑکی نے گردن جھکا لی۔

''سنو، یہاں کوئی ایسا محل ہے جس میں سو دروازے ہوں۔''

یہ سنتے ہی وہ آنچل میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔

''کیوں ہنس رہی ہو؟''

''تم اس محل کے شہزادے ہو کیا؟''

''اس محل کی دو ہزار چابیاں ہیں۔ ہر دروازے میں دس تالے..........'' وہ بولے جا رہا تھا۔

''ہاں ہاں......لیکن۔'' عورت نے ٹوکا۔

''لیکن کیا؟'' وہ عورت کی طرف تھوڑا سا جھک کر بولا۔

''لیکن وہاں کوئی نہیں جاتا۔ وہ بہت پرانا محل ہے۔ اس کے تالے عجیب طرح کے ہیں۔ ہر تالے میں دو دو سوراخ ہیں۔''

''ہاں ہاں وہی..........مگر وہ ہے کہاں؟''

''وہ سامنے والی پہاڑی کے اس طرف۔''

''میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔''

''مگر کیوں؟''

''بس یوں ہی۔''

''یہ ضرور تمہارا دوسرا جنم ہے۔ پہلے جنم میں تم شہزادے رہے ہو گے۔''

''دوسرا جنم؟''

''دوسرا جنم نہیں جانتے! اچھا یہ بتاؤ تمہارا دھرم......تمہاری ذات کیا ہے؟''

''دھرم...... ذات...... دوسرا جنم...... یہ سب کیا ہیں؟''

''ارے تم تو کچھ بھی نہیں جانتے۔'' اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''مجھے پہاڑی کے اس طرف جانا ہے۔''

''ابھی نہیں۔ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پہاڑی کی چڑھائی...... اور راستہ بھی بہت خراب ہے۔ کچھ دنوں بعد......'' وہ اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس کی طبیعت اب ٹھیک ہوتی جا رہی تھی مگر کمزوری...... اگر زیادہ چلتا پھرتا ہے تو سر چکرانے لگتا ہے۔ وہ دن بھر عورت کا انتظار کرتا رہا۔ اسے بھوک لگی، اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا، کھانے کی کوئی چیز نہ ملی تو بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ دن مندے عورت آئی، چراغ جلایا اور کھانا پکانے لگی۔ کمزوری دور ہوتے ہوتے کئی ماہ گزر گئے کہ اچانک ایک رات البرٹ کے قہقہوں کی گونج سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ جہاں سے آواز آ رہی تھی دوڑتا ہوا اس کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ کھونٹی پر لٹکی لالٹین کی لو تیز کی اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ پٹ کھل گئے۔

''کیا بات ہے۔ کیوں کراہ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

''نہیں مجھے بتاؤ۔ میری وجہ سے تمہیں......''

''یہ بات نہیں۔'' اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اس نے عورت کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھے تو اسے لگا کہ یہ گھوڑے کے زخمی کھر ہیں اور ان سے خون بہہ رہا ہے۔ خون پونچھتے پونچھتے پورا رومال تر ہو گیا تھا۔

''پریشان مت ہو، کچھ دور اور چلنا ہے۔''

''کیا؟''

''میرا مطلب، کیوں رو رہی ہو، تمہارا کوئی نہیں ہے کیا؟''

''بابا تھے، دو سال پہلے گزر گئے۔ دن بھر تیرے میرے گھر میں اور کبھی کبھار کھیتوں میں کام کرتی ہوں۔ بابا کی تھوڑی سی کھیتی باڑی ہے مگر کوئی کرنے والا نہیں۔''

کچھ دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر وہ اپنے کمرے کی طرف مڑا، عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے آنے لگی اور دونوں ایسے مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئے جہاں سے باہر نکلنے کا راستہ تنگ تھا۔

'' یہ گھر دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ تم ...... ؟

'' بابا اسکول میں ماسٹر تھے ۔ کچھ بچتا ہی نہیں تھا ۔ بس یہ سامان اور یہ کتابیں بچی ہیں ''

بے کار کتابیں۔''

''تمہارا اور کوئی نہیں ہے؟''

وہ خاموش رہی۔

''اب میں آ گیا .... میرا مطلب اب میں آ گیا ہوں تو تمہیں اور پریشانی ہو رہی ہوگی۔''

''نہیں مجھے تو خوشی ....'' بات کو ادھورا چھوڑ کر عورت نے کرسی کھسکائی اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

''یہاں میں اس طرح تمہارے گھر میں ہوں، قصبے والوں کو کوئی اعتراض۔''

''نہیں یہاں کے لوگ مہمانوں کی بہت آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اور پھر بابا کے پاس باہر سے لوگ آتے ہی رہتے تھے۔''

''مجھے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' شاید اس کے سوال کا جواب نہ دینے کے لیے وہ جلدی سے نام پوچھ بیٹھی تھی۔

''تم نے کہا تھا، میرا دوسرا جنم ہے۔ اب تم جو چاہو نام رکھ لو۔''

''اچھا پچھلے جنم میں تمہارا کیا نام تھا؟''

''پچھلے جنم کا تو کچھ یاد نہیں۔''

''بابا کو دو نام پسند تھے۔ جیوتی اور سندیپ۔ میرا نام تو جیوتی رکھ دیا اور......''

''اور تم میرا سندیپ رکھنا چاہتی ہو۔''

''ہاں .... کیا تمہیں یہ نام پسند نہیں؟''

''نہیں نہیں مجھے تو بہت پسند ہے۔ مجھے تو بغیر نام کے رہنا بھی پسند ہے۔''

''اچھا اب میں جاؤں۔ سویرے کام پر بھی جانا ہے۔''

اس نے لالٹین کی لو کم کی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صبح جیوتی کے جانے کے بعد وہ بھی گھر سے نکل پڑا اور قصبے کے باہر باہر پہاڑی کی طرف چل دیا۔ تھوڑی ہی چڑھائی چڑھا ہوگا کہ زخم ہرے ہونے لگے۔

''کیا میں آرام کا عادی ہو گیا ہوں؟ نہیں ...... مجھے ہر حالت میں محل تک پہنچنا ہے۔''

اور وہ پہاڑی کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ گیا مگر اس میں اور آگے جانے کی ہمت بالکل نہیں تھی۔ تھک کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ سانس پھول رہی تھی، آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ کچھ دیر بعد کھڑا ہوا تو اسے دور محل کے مینار دکھائی دیے۔ نہ وہ خوشی سے اچھلا اور نہ ہی بے تحاشا محل کی طرف دوڑا۔

''حیرت ہے!''

محل کے پانے سے زیادہ خوشی تو محل کی چابیاں پا کر ہوئی تھی۔ خوشی کا تعلق صرف خواہش کی تکمیل سے نہیں ہے بلکہ مناسب وقت پر خواہش کی تکمیل سے ہے۔ خواہشیں اکثر پوری ہوتی ہیں مگر خوشی شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ شاید وہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد، اتنی محنت اور تکلیف برداشت کر کے محل تو ملنا ہی تھا۔ یہ اس کی اجرت ہے، یہ اس کا حق ہے۔ یا پھر یہ اطمینان تھا کہ محل قریب ہے اور چابیاں اس کے پاس ہیں۔

''بہت تھک چکا ہوں۔ راستہ دیکھ ہی لیا۔ پھر کسی روز آ کر..........''

وہ لوٹ پڑا، واپس، جیوتی کے گھر کی طرف، جہاں سونے کے لیے پلنگ تھا، سردی اور بارش سے بچنے کے لیے چھت۔

''کچھ ہی دنوں میں ہم دونوں کے دن پھر جائیں گے۔'' اس نے سوچا۔

''ہم دونوں؟'' وہ آپ ہی آپ شرما گیا۔ پھر اسے جیوتی کی بہت یاد آنے لگی۔

''شام ہو چکی ہے۔ ابھی تک جیوتی کام پر سے نہیں لوٹی ہے۔'' وہ انتظار کرنے لگا۔ جیوتی واپس آئی اور لالٹین جلا کر ہنڈیا ڈوئی سنبھال لی۔ کھانا تیار ہو گیا تو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

''یہ لو کھانا۔''

جیوتی کتنی خوبصورت ہے۔ پتلی پتلی انگلیاں اور چھوٹے چھوٹے چمکتے ہوئے دانت۔

''دانت!''

ہاں اس کی ماں کا دانت۔ سونے کا دانت۔ اس نے کھنکارا۔ حلق میں کچھ اٹک گیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ جیوتی کی خوبصورت انگلیاں چبا رہا ہے۔ کھانا جیوتی کی طرف کھسکا دیا اور

اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا، کیوں نہیں کھاتے، طبیعت خراب ہے کیا؟''

''نہیں''

''پھر؟''

''تمہارے بابا کون سے اسکول میں پڑھاتے تھے؟''

''کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں بھی.........'' اسے محسوس ہوا کہ سامنے ابن سعید بیٹھا تھیلی سے کچھ سکے نکال کر گن رہا ہے۔

''پھر تو یہیں رہو گے نا۔'' جیوتی نے خوش ہو کر پوچھا۔''

''معلوم نہیں، مگر مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ تم دن بھر...........''

''اچھا یہ کھانا تو کھا لو۔''

''نہیں جیوتی، پہلے یہ بتاؤ کیا مجھے وہاں نوکری مل سکتی ہے؟''

''بہت چھوٹا سا اسکول ہے وہ۔ وہاں کوئی رکتا نہیں ہے۔ تنخواہ بھی بہت کم ملتی ہے۔''

''تب تو وہاں نوکری بھی آسانی سے ہی مل جائے گی۔''

وہ بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ تھکا ماندہ تھا فوراً نیند آ گئی۔

اب وہ روزانہ صبح اسکول جاتا ہے اور شام کو قصبے کے بچوں کو ان کے گھروں پر جا کر ٹیوشن بھی پڑھاتا ہے۔ اس نے جیوتی کے بابا کی کاشت بھی سنبھال لی ہے۔ جیوتی نے کام پر جانا بند کر دیا ہے۔ وہ دن بھر کا تھکا ہارا رات کو بے سدھ ہو کر سو جاتا ہے۔ اب اس نے خواب دیکھنے بند کر دیے ہیں۔

''سندیپ تمہارا وطن؟'' اس سوال سے وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

''جیوتی میں بھی تمہاری ہی طرح تنہا ہوں۔''

جیوتی خاموش ہو گئی۔

بارش ہو رہی ہے۔ رات اندھیری ہے، کبھی کبھی بجلی چمکتی ہے تو وہ سہم جاتا ہے۔ زور زور سے بادل گرج رہے ہیں۔ تیز آواز کے ساتھ بجلی کڑکی تو وہ اٹھ کر کھڑکی بند کرنے لگا۔

''سندیپ۔''

''تم سوئیں نہیں؟''

سندیپ ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں۔''

''تمہاری صندوقچی میں یہ چابیاں............''

''میں خود بتانا چاہتا تھا کہ میرے پاس پہاڑی کے پیچھے والے محل کی چابیاں ہیں۔ دو ہزار چابیاں۔''

• ''محل کی چابیاں؟ وہ محل تو برسوں سے ویران پڑا ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''نہیں جیوتی، میں اس محل کی خاطر ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آیا ہوں۔ کل چھٹی ہے۔ میں وہاں جاؤں گا۔ ذرا سویرے اٹھا دینا۔''

جیوتی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ چپ ہو گئی۔

بادل گرجتے رہے۔ بجلی چمکتی رہی اور وہ بستر پر جا لیٹا۔ صبح اٹھا' تب تک بارش تھم چکی تھی۔ آسمان بھی صاف تھا۔ جیوتی نے اسے صندوقچی لا کر دی۔

''جیوتی آج موسم بہت خراب ہے۔ پہاڑی پر بہت پھسلن ہو گی اور آج بدن میں کچھ اینٹھن سی بھی ہے۔ اگلے ہفتے...... اگلے ہفتے تم بھی میرے ساتھ چلنا۔''

''میں! نہیں سندیپ وہاں............''

''کیا وہاں............ وہ دیکھو آسمان کتنا صاف دکھائی دے رہا ہے۔ موسم کتنا اچھا ہے۔''

سندیپ نے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا اور وہ دونوں کھڑکی سے منہ نکال کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

جب وہ دونوں محل کے تاریک برآمدے میں داخل ہوئے تو چمگادڑ کی بو اور سیلن کی مہک سے ان کا دماغ پھٹنے لگا۔ سندیپ نے چھت کی طرف دیکھا، کئی چمگادڑیں کنڈوں میں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔

"یہ دیکھو، محل کا پہلا دروازہ ہے۔" جیوتی نے سندیپ کو مخاطب کیا۔ سندیپ نے دیکھا دروازے میں دس کنڈے تھے اور ہر کنڈے میں دو سوراخوں والا تالا۔ جیوتی نے ڈرتے ڈرتے تالے کو چھوا اور بولی۔

"سنا ہے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اسی طرح کے سو دروازے ہیں۔"

سندیپ نے جیوتی کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور محل کی عمارت کو غور سے دیکھنے لگا۔ کئی دیواریں گر کر کھنڈر بن گئی تھیں۔ مینار ٹوٹ کر آدھے رہ گئے تھے اور تالوں میں زنگ اس طرح لگ گیا تھا کہ ان کے سوراخ چھوٹے ہو گئے تھے۔

"یہاں کوئی نہیں آتا۔ کچھ کا خیال ہے، یہ محل ایک بہت پرانے راجا نے بنوایا تھا۔ جب بن کر تیار ہوا تو بستی میں ایسا اکال پڑا کہ لوگ بھوکے مرنے لگے۔ طرح طرح کی وباؤں نے بستی کا راستہ دیکھ لیا اور پھر ایک دن راجا اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے بھاگ گیا۔ بس ایک صندوقچی اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں کے لوگ اس محل کو اشبھ سمجھتے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے سندیپ۔"

"یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ جس چیز پر قابو نہیں ہوتا اسے لوگ دیوتا مان لیتے ہیں یا اشبھ۔ کسی کے پاس محل کی چابیاں ہی نہیں تھیں اور یہ تالے اور لوہے کے دروازے اتنے مضبوط ہیں کہ ٹوٹ بھی نہیں سکتے۔ اسی لیے لوگ............"

"مگر سرکار؟"

"سرکار............ ہُنہ۔" سندیپ نے گردن جھٹکی اور چابیوں کی صندوقچی کھول کر سوراخ میں چابی لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

"مگر یہ صندوقچی تمہیں کیسے ملی؟" جیوتی نے پوچھا۔

"جستجو اور محنت سے۔"

"جیوتی کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی کہ ایک چمگادڑ اڑی اور کبھی دیوار سے، کبھی دروازے سے اور کبھی برآمدے کے در سے بار بار ٹکرانے لگی۔ جیوتی سہم گئی اور سندیپ کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"چلو، یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے جیوتی کا ہاتھ جھٹک دیا اور چابی سے تالے کے سوراخ پر جمے زنگ کو

کھرچنے لگا۔ جب زنگ صاف ہوگیا تو اس نے سوراخ میں چابی ڈال کر گھمائی۔ چابی نہیں گھومی۔اس نے صندوقچی سے دوسری چابی نکالی اور گھمانے لگا۔ یہ چابی بھی پوری نہ گھوم سکی۔ اس نے بہت سی چابیاں لگائیں مگر..........

''ہوسکتا ہے ایک سوراخ کھولنے کے لیے سینکڑوں چابیاں لگانی پڑیں۔ پھر دوسرا سوراخ۔ اور اس طرح سو دروازے کھولنا۔ اُف۔''اس نے چابیاں ہاتھ سے پٹخیں اور دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔جیوتی چابیوں کو چھو چھو کر دیکھنے لگی اور بولی۔

''تمام چابیاں ایک ہی جیسی ہیں۔ کس تالے کی کون سی چابی ہے یہ پتا لگانا بہت مشکل ہے۔''

''یہی تو مشکل ہے۔ چابیاں ہوتے ہوئے بھی..........وہ اُٹھا اور کئی گھنٹے تک سوراخ میں چابیاں گھماتا رہا مگر ایک بھی سوراخ کھولنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

''تالوں کے اندر تک زنگ لگا ہوا ہے،تیل ڈالنا پڑے گا۔''

''ہاں سندیپ۔اب شام بھی ہوگئی ہے،راستہ بہت خراب ہے،پھر کسی دن......''

اور وہ دونوں چابیوں کی صندوقچی لے کر واپس لوٹنے لگے۔

''سندیپ تم نے بستی والوں پر ایسا جادو کر دیا کہ ہماری شادی پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی۔''

''اور تم نے بھی تو سہیلیوں سے جھوٹ بولا تھا کہ بابا اپنی زندگی میں ہی سگائی کر گئے تھے''۔

جیوتی نے شرما کر اپنا منہ چھپالیا۔پھر وہ دونوں کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔

سندیپ کو یہاں آئے ایک مدت گزر چکی ہے۔صبح سے شام اسکول میں اور رات بچوں کے گھروں پر ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے ہو جاتی ہے۔دیر رات قصبے کے کچھ لوگ گھر پر آجاتے ہیں یا وہ لوگوں کے گھر رات گئے تک شطرنج کھیلتا رہتا ہے۔

''یہ لو سندیپ جی،آپ کا گھوڑا پٹ گیا۔''

اسے لگا کہ البرٹ نے اپنی موٹر گاڑی کے پہیوں کے نیچے اس کے گھوڑے کو کچل ڈالا ہے۔

''سندیپ جی آپ ہمیشہ بازی ہار جاتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کھیلتے وقت آپ کہیں اور

ہوتے ہیں۔"

"کیا کروں، یا تو کام سے فرصت نہیں ملتی یا پھر کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ بس طبیعت الجھتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو سب کچھ چھلاوا لگتا ہے، اپنا نام بھی۔"

سندیپ نے جمائی لی اور کھیل ادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف چل دیا۔

"جیوتی دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"کیا ہوا، کہیں بخار تو نہیں۔"

"نہیں، بس لگتا ہے کہ میرے کندھوں پر ایک نہیں تین تین آدمی سوار ہیں۔ لگتا ہے میں ہوں ہی نہیں۔ وہ تینوں جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ میں اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں پاتا۔"

"تم نے اپنے اوپر کام کا بوجھ بہت ڈال لیا ہے۔"

"ہاں، کل سے بچوں کا امتحان شروع ہے۔ صبح ذرا جلدی جانا پڑے گا۔ لاؤ کچھ کھانے کو دے دو..........."

جیوتی کھانا نکالنے لگی۔ جیسے ہی پتیلی کھولی اسے ہینگ کی بو آئی اور ابکائیاں آنے لگیں۔ وہ دوڑ کر جیوتی کے قریب پہنچا۔

"کیا بات ہے جیوتی؟"

جیوتی نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا، لمبی لمبی سانسیں لینے لگی اور پھر اسے ایک بڑی سی قے ہوگئی۔ سندیپ نے پیچھے سے آکر جیوتی کے دونوں کندھے پکڑ لیے۔

"جیوتی.......... جیوتی.........."

جیوتی نے الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہاں وہاں الماری میں املی.............."

☆

تیز ہواؤں کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا کہ اچانک بجلی چمکی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ چمک۔ آنکھیں

چندھیا دینے والی چمک ۔ وہ چیخا۔

''جیوتی ۔ میری صندوقچی کہاں ہے؟''

''کیا بات ہے ۔ اتنی رات گئے.........''

''ہاں جیوتی ، میں اسی وقت محل جاؤں گا۔''

''مگر موسم بہت خراب ہے ۔ بالکل اندھیرا ہے۔''

''ہاں ، جہاں جیوتی ہے وہیں اندھیرا ہے ۔ میرا مطلب بہت اندھیرا ہے ، تم چراغ جلالو ، میں لالٹین لے کر جا رہا ہوں۔''

''لیکن صبح اسکول......... تمہیں تو صبح اسکول جلدی جانا ہے۔''

''یوں کبھی فرصت نہ مل پائے گی ۔ تالوں میں تیل ڈالے بھی ایک زمانہ بیت گیا ۔ تم سو جاؤ ، میں صبح تک آجاؤں گا ۔ اور دیکھو دل گھبرائے تو رامائن کا پاٹھ کر لینا۔''

مہاویر ۔ ہاتھی دانت کی جنیؤ پہنے مہاویر ، سندیپ کے سامنے کھڑا تھا ۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ مہاویر کی طرف سے منہ پھیر لیا تو اس کے سامنے صندوقچی ...... دو ہزار چابیوں والی صندوقچی آگئی۔

وہ صندوقچی لیے پہاڑ پر چڑھ رہا تھا کہ پھسل پڑا اور لالٹین کا شیشہ چکنا چور ہو گیا ۔ صندوقچی ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی ۔ اس نے دیکھا کہ صندوقچی کھل گئی ہے اور کچھ چابیاں باہر نکل کر زمین پر جا پڑی ہیں ۔ دل دھک سے رہ گیا اور وہ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چابیاں ڈھونڈنے لگا ۔ چابیاں ملتی جاتی تھیں اور وہ صندوقچی میں رکھتا جاتا تھا۔

''کہیں کوئی چابی اُچٹ کر اِدھر اُدھر نہ چلی گئی ہو ۔ اگر ایک چابی بھی گئی تو بس۔''

اس نے سوچا اور بہت دیر تک ٹٹولتا رہا ۔ جب اطمینان ہو گیا تو صندوقچی کو اچھی طرح بند کیا اور محل کی طرف چلنے لگا۔

بارش تیز ہوتی جا رہی ہے ۔ بار بار اس کا پاؤں پھسلتا ہے ۔ وہ بہت آہستہ آہستہ پیر جما جما کر پہاڑی پر چڑھ رہا ہے ۔ گھنا اندھیرا ہے ۔ لالٹین ٹوٹ چکی ہے ۔ ''تو کیا ہوا؟ اٹکل سے بھی تو سوراخ میں چابیاں لگا سکتا ہوں ۔ محل کی طرف سے اتنی بے پروائی نہیں برتنی چاہیے۔'' ہوا کا تیز جھونکا آیا تو اس نے سہارے کے لیے ایک چٹان کو پکڑ لیا۔

''چٹان ۔ ہاں اس چٹان کے نیچے ایک آدمی کے بیٹھنے بھر کی جگہ ہے ۔ تھوڑی دیر

یہاں بیٹھ کر بارش تھمنے کا انتظار کرلیا جائے۔'' اس نے سوچا اور چٹان کے نیچے بیٹھ گیا۔ بادل گرجتے رہے، بجلی چمکتی رہی اور بارش، موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔

''اس موسم میں بارش فصلوں کو تباہ کردے گی۔ اس سال بابا کی زمین پر فصل اچھی ہوئی ہے۔ اگر ماری گئی تو .... خرچ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ جیوتی کو تے ہوئی ہے اب تو خرچ اور بڑھ جائے گا۔ کھیت میں پانی بھر گیا ہوگا۔

پانی سے پوری فصل گر جائے گی۔ اگر نالے کی طرف کا ڈھورا کاٹ دیا جائے تو فصل بچ سکتی ہے۔''

اس نے صندوقچی اٹھائی اور محل کی طرف جانے کے بجائے پہاڑی سے واپس نیچے کی طرف اترنے لگا۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ مگر اب اسے پھسلنے کا خوف تھا نہ گرنے کا ڈر۔ اس کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔

''اگر میں جلدی کھیت پر نہ پہنچا تو ....''

اور وہ تقریباً دوڑنے لگا۔

''مگر پھاوڑا تو ہے نہیں۔ لیکن مٹی بہت گیلی ہو گئی ہوگی۔ ہاتھ سے بھی ڈھورے کو توڑا جا سکتا ہے۔''

وہ کھیت پر کب پہنچ گیا تھا، یہ احساس ہی نہیں ہوا۔ اب وہ پھاوڑے کی جگہ صندوقچی سے ڈھورا توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صندوقچی تھامے دونوں ہاتھ سر کے اوپر تک لے جاتا اور پوری قوت سے صندوقچی کو زمین پر دے مارتا۔ مٹی ڈھیلی پڑنے لگی۔ کچھ کھیت میں بھرے ہوئے پانی نے زور مارا اور باندھ ٹوٹ گیا۔ پانی کھیت سے نکل کر نالے میں بہنے لگا اور وہ کھیت کی مینڈ پر کھڑا بہت دیر تک نالے میں بہتے پانی کو دیکھتا رہا۔

بارش تھمی اور کئی ماہ تک تھمی رہی تو ایک روز اس نے صندوقچی پر جمی دھول کو صاف کیا۔ صندوقچی کا رنگ نکھر آیا مگر جیوتی پیلی پڑ چکی تھی۔ آج اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی مگر وہ جیوتی کو اسی حالت میں چھوڑ کر صندوقچی ہاتھ میں لیے محل کی طرف چل پڑا۔ اسے ہمیشہ اپنے کندھوں

پر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا مگر اس وقت وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا اسکول دو مہینے کے لیے بند ہو گیا تھا۔

''آج میرا راستہ اونچی چٹانیں اور گہری کھائیاں بھی نہیں روک پائیں گی۔ دو مہینے میں محل کے تمام دروازے کھل جائیں گے اور میں محل کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

غلام گردش میں پہنچ کر پہلے دروازے کے نزدیک صندوقچی رکھی اور تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک سوراخ میں چابی پوری گھوم گئی، وہ اچھل پڑا۔

''کھل گیا!''

آج پہلی بار اسے یقین آیا کہ البرٹ، مہاویر اور ابن سعید قتل کر دیے گئے ہیں۔ خوشی سے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ ایک ایک چابی کئی کئی من کی محسوس ہوئی۔

''انسان ہمت کرے، کیا نہیں ہو سکتا۔''

اور وہ جلدی جلدی دوسرے سوراخ میں چابیاں لگانے لگا۔ پل بیتے، پہر گزرے، وقت کے پاؤں پنکھ بنے مگر کوئی چابی دوسرے سوراخ میں پوری نہ گھوم سکی۔

''ہو سکتا ہے صندوقچی کی آخری چابی سے یہ سوراخ کھلے لیکن میں ہمت نہیں ہاروں گا۔ یوں ہی اتنا وقت برباد ہو گیا۔ اب تو دو مہینے کی چھٹیاں بھی ہیں۔''

اور پھر کچھ اس طرح چابی لگی کہ دوسرا سوراخ بھی کھل گیا۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی، شام ہوتے ہوتے چار تالے کھول ڈالے۔

'برآمدے میں کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا مگر بھوک کا قطعی احساس نہیں ہے۔ نظروں میں محل کے آخری کمرے کا نقشہ بار بار گھوم جاتا ہے اور آنکھیں تیز روشنی سے چندھیا جاتی ہیں۔ محسوس ہوا کہ سنہری تیر آنکھوں میں بھک گئے ہیں۔ جیوتی ایک ایک کر کے آنکھوں سے تیر نکال رہی ہے۔

جیوتی!

آج جیوتی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ بے چاری نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ اب آدھی رات ہونے کو ہے، انتظار کر رہی ہوگی۔ آج کئی تالے کھل گئے، وہ کتنا خوش ہے، گھر پہنچتے ہی جیوتی کو یہ خوش خبری سنائے گا۔ مگر جیوتی...... وہ تو ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ محل میں کچھ بھی نہیں ہے، تم اس کا

خیال چھوڑ دو۔ جیوتی کو کیا معلوم؟ اگر اس نے وہ چمک دیکھی ہوتی تو......'

اس نے چمکتی ہوئی چابیوں کی طرف دیکھا اور کھلے ہوئے تالوں کی چابیاں علاحدہ رکھ کر باقی چابیاں صندوقچی میں رکھنے لگا۔

☆

جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اس نے دیکھا کہ پڑوس کی کئی عورتیں گھر میں جمع ہیں۔ گھبرا کر پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''ہش ش .... دھیرے، بچہ ابھی سویا ہے۔''

''بدھائی ہو۔ لڑکا ہوا ہے۔''

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر مایا دائی کے پاس جا کر بولا۔

''جیوتی کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے، وہ بھی سو گئی ہے۔ سویرے سے ہی درد شروع ہو گیا تھا۔''

پیچھے سے آواز آئی۔

''ماسٹر جی تمہاری شکل ہے۔ ایسا ہی ناک نقشہ ہے۔''

سندیپ کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور وہ جلدی سے صندوقچی لیے اپنے کمرے میں گھس گیا۔

<< ننھے سے رتھ میں بچے کو بٹھا کر مہاویر باغ کی سیر کرا رہا ہے۔ ابنِ سعید نے اس کے ہونٹوں سے اپنا نقشیں پیالہ لگا دیا ہے اور البرٹ اس کے لیے بہت سے کھلونے خرید لایا ہے۔ چھوٹے تالوں والی صندوقچیاں، چابی سے چلنے والی موٹر گاڑیاں۔ اور وہ خود اجنبیوں کی طرح اپنے بچے سے دور کھڑا ہے <<

کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دھڑ، دھڑ، دھڑ، کسی نے دروازہ زور سے پیٹا۔

''ابھی تک سو رہے ہو ماسٹر جی۔ میں زچہ کے پاس رات بھر بیٹھی رہی، اب جا رہی ہوں۔ بابو پنساری کے ہاں سے گھٹی لا کر رکھ دینا، کل تو رام وتی سے مانگ لائی تھی۔

اور ہاں کچھ میوے اور دیسی گھی بھی ۔ زچہ بہت کمزور ہے ۔تھوڑی کھلائی کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے، جاتا ہوں۔''

''اس نے منہ دھویا اور سیدھا بازار کی طرف چل دیا۔ سامان لے کر گھر لوٹا تو دیکھا کہ بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔

''کیا ہوا جیوتی؟''

''دیکھو تو ذرا، لگتا ہے پیٹ ابھر رہا ہے۔ ڈاکٹر بابو کو بلالو۔''

''یہاں بلالاؤں؟'' بے خیالی میں اس کا ہاتھ جیب پر چلا گیا۔

''ہاں۔ کیوں!''

''لاؤ وہیں دکھالاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لپیٹ کر لے جانا۔''

''ہوں۔ اور تم مایا دائی آجائے تو دودھ گرم کروا کے پی لینا۔''

اور اس نے بچے کو ڈاکٹر کے یہاں لے جانے کے لیے گود میں اٹھالیا۔

جیوتی بہت کمزور ہے ابھی تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئی ہے۔ گھر کا سارا کام سندیپ کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ دو مہینے کی چھٹیاں تھیں ورنہ جیوتی بھوکی پیاسی ہی پڑی رہتی اور بچہ بھی۔ جیوتی کے دودھ بھی کم اترتا ہے، گھر میں کوئی اور ہے نہیں جو اوپر کا دودھ پلائے۔ مایا دائی کبھی کبھار آجاتی ہے اور ہمیشہ سندیپ کو ڈانٹتی ہی رہتی ہے۔

''بچے کو دودھ نہیں پلایا۔ حلوا اتنا جلا دیا کہ دکھیاری سے کھایا ہی نہیں گیا۔ میوے بھی ختم ہو گئے ہیں۔......''

'اس کی جیب میں پیسے بھی تو ختم ہو گئے ہیں۔ دو دفعہ قرض لے چکا ہے، اب کس سے مانگے اور کس منہ سے مانگے۔ چھٹیوں میں کوئی اپنے بچوں کو ٹیوشن بھی نہیں پڑھواتا۔ فصل کٹنے کا بھی وقت آگیا ہے۔ ادھر کچھ دنوں کھلیان میں رہنا پڑے گا۔ اسکول کھلنے میں ایک ہفتہ باقی ہے، پھر وہی سلسلہ۔ صبح اسکول جانا، شام کو لوٹنا، ٹیوشن اور اپنے بچے اور جیوتی کی دیکھ بھال۔'

وقت گزرتا رہا اور بچہ مہاویر کے رتھ میں بیٹھا، ابنِ سعید کا کٹورا منہ سے لگائے، البرٹ کے جاپانی کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے بڑا ہونے لگا کہ اچانک یاد آیا: 'اس کا نام بھی تو رکھنا ہے۔'

''جیوتی بتاؤ کیا نام رکھیں اس کا؟''

''اس کا نام تو تمہیں ہی رکھنا ہے۔''

''اچھا کیا ایسا نہیں ہو سکتا، اس کا کوئی نام نہ رکھیں۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ ضروری نہیں بڑا ہو کر یہ ہمارا رکھا نام پسند کرے۔''

''اب ایسا بھی کیا۔ کوئی نام تو رکھنا ہی ہوگا۔''

''تو ٹھیک ہے ابھی ہم اسے مُنّا کہا کریں گے۔ ننھا سا پیارا سا میرا مُنّا۔''

اور سندیپ نے مُنّا کو اٹھا کر آسمان کی طرف اچھال دیا۔ جیوتی مسکرا دی اور بولی۔

''بالکل تم پر گیا ہے۔''

دونوں مُنا کے ساتھ کھیلنے لگے اور برسوں تک کھیلتے رہے، اور پھر مُنّا اتنا بڑا ہو گیا کہ اس نے ''اماں'' اور ''بابا'' کہنا سیکھ لیا۔ اب وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر چلنے کی کوشش میں دن بھر گڑ ولنا لیے پھرتا ہے اور توتلی زبان میں سندیپ کی ہر بات کا جواب دینا چاہتا ہے۔ سندیپ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار پاتا اور ہمیشہ اسے اپنے ساتھ ہی سلاتا ہے۔

''مُنّا اِدھر آؤ۔ سو جاؤ۔''

مُنّا سو گیا۔ سوتا رہا، اٹھتا رہا اور ایک دن جب رات کے تیسرے پہر سندیپ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چارپائی پر مُنا نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ منا برابر پڑے کھٹولے پر گٹھری بنا پڑا تھا۔ سندیپ مسکرا دیا۔

'ابھی سے الگ سونا چاہتا ہے۔ بہت شریر ہے۔ دن بھر دوڑتا پھرتا ہے۔ ہرن کی طرح، ناف میں مُشک چھپائے ہرن کی طرح۔ تو کیا ہوا؟ ایسے بچے ہی کچھ کر دکھاتے ہیں۔ آخر قصبے کے سب سے اچھے اسکول میں پڑھتا ہے۔ ضرور کچھ کر دکھائے گا۔ اس سال دوڑ میں اسے پہلا انعام ملا ہے۔'

''جیوتی مُنّا کی نظر اتار دو۔''

شاید جیوتی نے اس دن نظر نہیں اتاری تھی۔ اسی لیے وہ اس سال امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔ دن بھر اسکول سے، گھر سے، یہاں تک کہ بستی سے غائب رہتا ہے۔ وہ کہاں جاتا ہے یہ سوچ سوچ کر آج سندیپ بہت پریشان تھا۔

مُنا اب نو اور دو گیارہ سال کا ہو گیا تھا۔ ایک روز منا جب آدھی رات کو گھر واپس لوٹا تو سندیپ نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''کہاں تھے؟''

منا نے کتنے اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا۔

''بابا، آپ نے نُنی کی قبر دیکھی ہے۔ سامنے والی پہاڑی پر۔ جہاں سے پرانا ٹوٹا ہوا محل دکھائی دیتا ہے۔''

''مُنا۔'' وہ بہت زور سے چیخا۔ ''تم وہاں کیا کرنے گئے تھے۔ اگر آئندہ گئے تو ہاتھ پاؤں توڑ ڈالوں گا۔''

منا کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ غصے کے عالم میں گردن جھکائے کھڑا رہا۔

شام ہو چکی ہے۔ سورج غروب ہوئے دیر ہو گئی مگر مُنا ابھی تک نہیں لوٹا۔ جیوتی پریشان ہے اور سندیپ غصے اور اضطراب کی حالت میں باہر جاتا ہے کبھی اندر آتا ہے اور پھر جیوتی پر برسنے لگتا ہے۔ جیوتی رونے لگی تو اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔

''تم ماں ہو، اسے گھر میں روک کر نہیں رکھ سکتیں...... دن بدن اس کی آوارہ گردی بڑھتی جا رہی ہے۔ پتا نہیں اتنی رات تک کہاں رہتا ہے۔ کہاں کہاں حرام زادے کو ڈھونڈتا پھروں۔''

سندیپ غصے میں گھر سے باہر نکل گیا اور جب ہر جگہ ڈھونڈ کر واپس لوٹا تو دیکھا کہ مُنا پلنگ پر پڑا سو رہا ہے۔ مُنا گہری نیند سو چکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں مگر ڈھیلے زور زور سے چل رہے تھے۔

''شاید خواب دیکھ رہا ہے۔''

مُنا سوتے میں ہنسا تو سامنے کے دو دانت نظر آئے۔ چمکتے ہوئے دانت۔ اس نے مُنا کے قریب جا کر اسے جھنجوڑ دیا اور چیخ کر بولا۔

''حرام زادے، دن بھر کہاں غائب رہا؟''

منا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

"بابا.............."

"بابا کے بچے ...." اور مسمسا کر کئی ہاتھ اس کے گال پر جڑ دیے۔ مُنا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، پھر آنسو چھلک آئے اور وہ سسکنے لگا۔ سندیپ نے ایک اور طمانچہ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ جیوتی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ کیا؟ سوتے سے اٹھا کر بچے کو اس طرح.............."

سندیپ نے جیوتی کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔

"تم لوگوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تمہاری وجہ سے اپنے راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ اب ایک نہیں سنوں گا۔"

اور وہ تیزی سے الماری کی طرف مڑا، صندوقچی نکالی اور باہر جانے لگا کہ جیوتی اس کے بازو سے لپٹ گئی۔

"اس وقت رات میں......؟ میں نہیں جانے دوں گی۔"

"چھوڑ دو مجھے، اب میں زیادہ وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ برسوں گزر گئے اور میں.............."

"ٹھیک ہے، اب رات میں ہی کیا ہے، صبح چلے جانا۔"

جیوتی نے التجا کی مگر اس نے زور سے دھکا دیا اور صندوقچی لے کر پہاڑی کی طرف جانے لگا۔

پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے وہ بہت تھک چکا ہے۔ آج بہت دنوں بعد اسے محل کا خیال آیا۔ اتنے برسوں میں وہ صرف پانچ دروازے کھول پایا ہے۔ پہاڑی سے محل کے ٹوٹے مینار چاند کی روشنی میں صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کی صندوقچی سے صرف سو چابیاں ہی کم ہوئی تھیں مگر اسے آج وہ بہت ہلکی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڑھتا رہا کہ اب محل کے بہت قریب آن پہنچا تھا۔

وہ کئی گھنٹے تک برآمدے کے در سے کمر ٹکائے بیٹھا رہا۔ آج اس کا دل بہت

اچاٹ ہے۔ محل کے دروازے تک آ کر بھی تالے کھولنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔

''برسوں گھر کے جھمیلوں میں الجھا رہا، اب وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ بار بار اٹھنے کا ارادہ کرتا مگر یہ سوچ کر ہمت پست ہو جاتی کہ سینکڑوں تالوں میں آج دو چار کھل بھی گئے تو کیا۔ نیند سے آنکھیں بوجھل تھیں اور ان میں جلن ہو رہی تھی۔ جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی میں بار بار چمک سی اٹھتی تھی۔ سوچا تھوڑی دیر آرام کر لیا جائے، رات بھر جاگنا ہے اور پھر صبح اسکول ....

اسکول کا خیال آتے ہی مُنا اور جیوتی یاد آنے لگے۔

''جیوتی نے مجھے روکا بھی نہیں؟''

''روکا تو تھا۔''

''وہ زبردستی بھی تو کر سکتی تھی۔ اگر روکنا چاہتی تو روک ہی لیتی۔'' اسے جیوتی پر غصہ آنے لگا۔

آج اس کی طبیعت بہت الجھ رہی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ محل کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر مر جائے۔ اس نے صندوقچی اٹھائی اور اسے کھولنے کے بجائے سر کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر کے برآمدے کے ٹوٹے فرش پر لیٹ گیا مگر فوراً ہی گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''دن بھر کا تھکا ہوا ہوں، آنکھوں میں نیند ہے، اگر بند کیں تو سو جاؤں گا۔''

اور وہ آنکھیں کھولے برآمدے کی چھت کو تکنے لگا۔ جسم میں ہلکی ہلکی سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ دونوں ٹانگیں پھیلا دیں اور تھوڑا سا زور لگا کر بدن میں تناؤ پیدا کیا، رانوں اور پنڈلیوں کا درد جاگ اٹھا۔ پھر اس نے پورے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تو اس کے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی۔ چھت پر ایک چمگادڑ ادھر اُدھر اڑ رہی تھی۔ چمگادڑ کو دیکھتے دیکھتے کوفت ہونے لگی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ غنودگی کا احساس ہوا اور جمائیاں آنے لگیں۔

''اب اٹھنا چاہیے۔'' اس نے سوچا مگر پھر کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

محل کے تمام دروازے آپ ہی آپ کھلتے جا رہے ہیں۔ وہ اندر اور اندر اور اندر داخل ہوتا جا رہا ہے۔ آخری دروازے پر اونچی اونچی پگڑیاں باندھے دو سنتری اس کا استقبال کرنے کے لیے کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں چاندی کی چھڑی میں سونے کے پھل جڑے نیزے ہیں۔

فرش پر مخمل کا غالیچہ بچھا ہے، جس میں اس کے پیر ٹخنوں تک دھنس گئے ہیں۔ وہ چاندی کے پایوں والی مخملی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ برابر کے کمرے سے گردن جھکائے ایک شخص نمودار ہوتا ہے اور دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر ایک چمڑے کا کوڑا اسے پیش کرتا ہے۔ وہ جیوتی پر کوڑے برسانے لگتا ہے۔ جیوتی کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں اور بدن سے خون بہہ رہا ہے۔ بال الجھے ہوئے ہیں۔ اور آنکھوں کا کاجل آنسوؤں کے ساتھ بہہ کر رخساروں پر پھیل گیا ہے۔ وہ جیوتی پر ان گنت کوڑے برسا چکا ہے۔ جیوتی فرش پر پڑی تڑپ رہی ہے اور اپنی مدد کے لیے اسی کو پکار رہی ہے۔

"سندیپ .... میرے سندیپ .... مجھے بچاؤ۔"

اس کا ایک ہم شکل پھٹے کپڑے پہنے کونے میں گردن جھکائے کھڑا ہے۔

"وہ ہے تمہارا سندیپ۔ پکارو اسے، وہ مجبور ہے، وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"بابا !! ...."

اس کے کانوں میں مُنا کے چیخنے کی آواز آئی۔ دونوں سنتری منا کو رسیوں سے باندھے گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ اس نے دیکھا مُنا کے جسم پر بے شمار مکڑی کے جالے لپٹے ہوئے ہیں۔ ایک سنتری نے اس کے بال پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ مُنا منہ کھولے اسے تک رہا ہے۔ اس نے مُنا پر بھی کوڑے برسانے شروع کر دیے ہیں۔

"بابا .... بابا ...."

مُنا بری طرح چیخ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مُنا پر کوڑے برساتا رہا۔ جیوتی چیخ رہی ہے۔ مُنا .... مُنا

اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا سورج نکلے دیر ہو چکی ہے۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"نہیں ...." وہ چیخا اور صندوقچی کو وہیں چھوڑ کر پہاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔

"میرا مُنا .... میں نے یہ کیسا خواب دیکھا ہے؟ نہیں، مُنا اور جیوتی کو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

وہ چلتے چلتے ٹھٹکا۔ صندوقچی، دو ہزار چابیوں والی صندوقچی، جس سے سو چابیاں کم ہو چکی ہیں ......؟ "ارے صندوقچی تو وہیں محل کے برآمدے میں رہ گئی۔"

اس نے لوٹنا چاہا کہ نظر چمکتے ہوئے سورج پر پڑی۔ سورج کافی چڑھ چکا تھا۔
'جیوتی انتظار کر رہی ہوگی۔ مُنا تو اسکول جا چکا ہوگا، آج وہ جیوتی کو خوب پیار کرے گا، معافی مانگے گا، اور مُنا کے اسکول جا کر اسے گود میں اٹھا لے گا۔ گود میں؟ وہ تو اب بہت بڑا ہو گیا ہے۔ اب وہ مُنا کو کبھی کچھ نہیں کہے گا، آخر بچہ ہی تو ہے۔ کل اسے سوتے سے اٹھا کر مارا۔ کیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ وہ جن بازوؤں کو ڈھال سمجھتا تھا وہی بازو اس پر قوت آزما رہے تھے۔ مُنا کے جوتے پھٹ گئے ہیں اور وہ کئی دن سے کرچ کے نئے جوتے خریدنے کی ضد کر رہا ہے۔ آخر دوڑ میں ہمیشہ انعام جو پاتا ہے۔ وہ خود بھی تو زندگی بھر دوڑتا ہی رہا ہے۔'

اب سندیپ پہاڑی پر مُنی کی قبر کے پاس پہنچ گیا تھا کہ اچانک ٹھٹھکا اور سہم گیا۔ مُنا مُنی کی قبر کے پاس کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس کے سر پر کھٹ سے کوئی چیز آ کر گری جیسے کسی نے چابیوں سے بھری صندوقچی دے ماری ہو۔ سر چکرانے لگا، پاؤں کانپنے لگے اور وہ منا کے پیچھے ایک سوکھے پیڑ کی آڑ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ مڑ کر دیکھا محل کے ٹوٹے میناروں پر دھوپ اتر آئی تھی۔

"مُنا.........نہیں مُنا........."

اس نے چیخنا چاہا مگر گلے میں آواز جیسے تھی ہی نہیں۔ مُنا جلدی جلدی ہاتھوں سے پتھریلی مٹی کو ہٹا رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر مُنا کو پکڑنا چاہا مگر وہ ہل بھی نہ سکا گویا اس کا پورا وجود ٹوٹے محل کا کھنڈر ہو گیا تھا۔ یکا یک مُنا خوشی سے چیخا اور عجیب وغریب آوازیں نکالنے لگا، ناچنے لگا اور پھر زور زور سے اُچھلا۔ اس نے غور سے دیکھا، مُنا کے ہاتھ میں ایک بڑی سی صندوقچی تھی۔ مُنا نے صندوقچی کھولی تو اس میں بے شمار چابیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ چابیوں کے علاوہ چاندی کی چھڑی میں لپٹا ایک ریشمی کپڑا بھی تھا جس پر سنہرے حروف سے لکھی ایک عبارت درج تھی۔ مُنا بلند آواز سے پڑھنے لگا۔

"یہ چابیاں جن کی تعداد دو ہزار ہے، ایک ایسے محل کی چابیاں ہیں جو یہاں سے ہزاروں میل دور مغرب میں واقع ہے۔ محل میں داخل ہونے کے لیے سو دروازے عبور کرنے ہوں گے، ہر دروازے میں دس تالے ہیں اور ہر تالا دو چابیوں سے کھلتا ہے۔"

"مُنا، یہ جھوٹ ہے۔" اس نے کہنا چاہا مگر اس کے گلے کو جیسے کسی نے اپنے پنجوں سے

جکڑ رکھا تھا۔ مُنا نے صندوقچی اٹھائی اور بہت تیزی سے مغرب کی طرف دوڑنے لگا۔

اس نے اپنے اندر کی پوری قوت کو یکجا کر کے آواز دی۔ ''مُنا رُک جاؤ......''

مگر اب مُنا اس کی آواز کی زد سے باہر تھا اور صندوقچی لیے مغرب کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ دوڑ میں ہمیشہ انعام جو پاتا ہے۔ وہ دور تک مُنا کو دیکھتا رہا، پھر مُنا اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے گھوم کر محل کی طرف دیکھا تو محسوس ہوا کہ محل کی عمارت بہت بوسیدہ ہو چکی ہے اور گہری دھند نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اب اسے وہاں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ سورج، نہ مینار، نہ محل۔ اس نے آہستہ سے گردن گھمائی اور وہ بھاری بھاری قدموں سے بستی کی جانب چل پڑا۔ !!

○○○

BAGH KA DARWAZA (Short Stories)

TARIQ CHHATARI

Rs.150/-

Address: NAZIMA MANZIL , AMIR NISHAN ROAD
DODHPUR- ALIGARH -202002
Phone:(0571) 404097

BAGH KA DARWAZA

(SHORT STORIES)

TARIQ CHHATARI